السحر

خالد یوسف

لبِ سحر

خالد یوسف

First edition: 1000 copies

Copyright November 1987

ISBN 0-948977-04-3

جملہ حقوق محفوظ

پہلا ایڈیشن ______ ۱۹۸۷ء

تعداد ______ ایک ہزار

سرورق ______ سُلطان فاروقی

خطاطی ______ قیصر محمود ، نثار المعظم

پبلشرز:

انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر

۱۶، ونڈرمیئر روڈ لندن ویسٹ ۵

تقسیم کار:

اُردو اکیڈمی (یو، کے)

16, Windermere Road, London W5 4TD
Tel: 01-567 6775

ادارۂ جمہور

68 White Road, Cowley, Oxford, OX4 2JL
Tel: Oxford 64316

جائزہ

لبِ سحر

- ڈاکٹر قمر رئیس
- احمد فراز
- موج فرازی
- سیّد عاشور کاظمی

اور

محمود ہاشمی دہلوی

ترتیب

۱	لب سحر کے نام	ڈاکٹر قمر رئیس	۱۳
۲	ایک نئی طرز کا ترقی پسند شاعر	(موج فرازی)	۱۶
۳	بات سے بات	(عاشور کاظمی)	۲۵
۴	در و دیوار کی بات	(مصنف)	۳۶
۵	دل گیسوئے جاناں سے بھی بیزار ہوا ہے		۴۳
۶	خواہ معصوم چلے، خواہ گنہ گار چلے		۴۵
۷	یہ ظلمتیں یہ فضا، یہ مہیب تنہائی		۴۶
۸	ملال اپنی تباہی کا کچھ زیادہ نہیں		۴۷
۹	اہل دل اُن کی جفاؤں کا گلہ کیا کرتے		۴۸
۱۰	الماس ہے، پکھراج ہے، کل دیکھئے کیا ہو		۴۹
۱۱	واعظ بنا، فقیہہ بنا، پارسا بنا		۵۰
۱۲	بنے جو شمس و قمر تنگِ آسماں نکلے		۵۱
۱۳	فکرِ گل و لالہ ہو تو پھر خار ہی بن جاؤ		۵۲
۱۴	صحرائے سخن میں ہیں جو ہم ابرِ گہر بار		۵۳
۱۵	قدم قدم پہ جلاتے رہو، چراغِ اُمید		۵۴

۱۶	باقی رہے نجات کا امکان کم سے کم	۵۵
۱۷	کہہ دو تو زباں زباں یہ ہوگا	۵۶
۱۸	ہجوم رنگ کو ارژنگ ہم نہیں کہتے	۵۷
۱۹	سُن کر وہ جس کا نام لرزتے ہیں شیر بھی	۵۸
۲۰	چارہ گر وہ بھی نہیں اور خوش گماں ہم بھی نہیں	۵۹
۲۱	راہ نجات یہ ہے کہ دولت کو بانٹ لو	۶۰
۲۲	قیس پابند گریباں ہے ذرا سوچو تو	۶۱
۲۳	وہ ایک لفظ جو لازم نہ تھا زباں کے لئے	۶۲
۲۴	گلے کا ہار ہوئی شب کی تیرگی اب تو	۶۳
۲۵	ہر چمن دوست پہ ہوتی ہی رہی مشقِ ستم	۶۴
۲۶	سُونے پڑے ہیں مصر کے بازار کیا کریں	۶۵
۲۷	وہ شاخ پر ہوں نمایاں کہ دستِ گلچیں میں	۶۶
۲۸	پھر سر سے کہیں شیخ کے دستار نہ گر جائے	۶۷
۲۹	تیرگی اور بڑھے، اور بڑھے، اور بڑھے	۶۸
۳۰	بجھنے لگے چراغ سرِ شام، کچھ تو ہو	۶۹
۳۱	پہنچ گئے ہیں قدم چاند پر بھی یاروں کے	۷۰
۳۲	حسبِ معمول وہ جھوٹا ہے، بہت ممکن ہے	۷۱
۳۳	سحر کی آس لئے شب کے دائروں میں رہے	۷۳
۳۴	مر مر کے تھپیڑوں کو صبا کون کہے گا	۷۴
۳۵	ناحق سپردِ دار ہوئے اور کیا کہیں	۷۵
۳۶	گھر اس کا اُجالوں سے منوّر نہیں ہوتا	۷۷
۳۷	جو پھول کھلا وہ شعلۂ غم، ہر لطف کی تہہ میں جبر و ستم	۷۸

۳۸	نصیحتوں کے یہ دفتر ہمیں قبول نہیں	۷۹
۳۹	دیکھو تو ہر اک شے پہ بہاروں کی پھبن ہے	۸۰
۴۰	صنم کے دل میں محبت کا کوئی خانہ نہ تھا	۸۱
۴۱	اگرچہ جتنے ستارے ہیں شب گزیدہ ہیں	۸۳
۴۲	ہوتی ہے وہ اب لالہ و گل کے آگے	۸۴
۴۳	سفر نصیب غبار دلِ زمانہ ہوتے	۸۵
۴۴	پتھر کے خدا ٹوٹ کے گر جائیں گے آخر	۸۶
۴۵	منکر ہی رہا شیخ اسے کاش خدا دے	۸۷
۴۶	اجل حیات پہ خنداں ہے ان سے کہہ دینا	۸۸
۴۷	وفا کی راہ میں کوئی تو بے وفا ہوگا	۸۹
۴۸	اگرچہ انکی جفا کو کبھی جفا نہ کہا	۹۰
۴۹	ہم نہ کہیں تو شعر کیا تم نہ سنو تو بات کیا	۹۱
۵۰	وہ نہیں آئے تو کیا صبح تو آئیگی ضرور	۹۲
۵۱	وفا کے تاج محل دوش پر اُٹھائے ہوئے	۹۳
۵۲	رشتۂ درد نبھاتے ہوئے کچھ دُور ضرور	۹۴
۵۳	دیکھئے اسکو تو ہر بات گلِ تر کی طرح	۹۵
۵۴	ہر لفظ کو عنواں کہیں یہ تو نہ ہوگا	۹۶
۵۵	نظر نظر فریب ہے بدن بدن فریب ہے	۹۷
۵۶	کوئی چہرہ نہ بنے تیرے تصوّر کا رقیب	۹۸
۵۷	چراغِ ضبطِ تمنا سے جل نہ جائیں کہیں	۹۹
۵۸	دل قلندر ہو تو انسان ستاروں سے بلند	۱۰۰
۵۹	اِدھر بھی جفائیں اُدھر بھی جفائیں	۱۰۱

۶۰	احباب کی قلت بھی گوارا ہے مگر ہم	۱۰۲
۶۱	وہ روٹھ جائیں تو خوابوں میں بھی وصال نہیں	۱۰۳
۶۲	احبابِ سبک گام پہ تنقید نہ کیجئے	۱۰۴
۶۳	مشتاق ہے دل کوئی تماشہ نظر آئے	۱۰۵
۶۴	کسی کو زہر کا پیالہ کسی کو آبِ حیات	۱۰۶
۶۵	شیخ بھی ہے آج کچھ بہکا ہوا	۱۰۷
۶۶	رفیقوں میں خطبوں خطابوں کی باتیں	۱۰۹
۶۷	یہ بام و در نظر آتے ہیں تیرے عارض و لب	۱۱۰
۶۸	دلِ یار پارۂ سنگ ہے ہمیں آج تک یہ خبر نہیں	۱۱۱
۶۹	چمن چمن یہ بیاباں اُفق اُفق یہ سراب	۱۱۲
۷۰	تری ہر ایک بات شرارہ ہے جانِ جاں	۱۱۳
۷۱	روش روش پہ ہیں کانٹوں کے سلسلے یوں تو	۱۱۴
۷۲	ہم غریبوں کی اگرچہ جان بھی نذرانے میں ہے	۱۱۵
۷۳	کچھ ساغر و مینا سے نہیں مے سے غرض ہے	۱۱۶
۷۴	عدو منت کشِ اہلِ سخن ہیں	۱۱۷
۷۵	دستِ گلچیں پہ بہاروں کو فدا دیکھا ہے	۱۱۸
۷۶	جو چپ رہے تو در و بام ہو گئے ہم لوگ	۱۱۹
۷۷	گریاں ہے آبشار ترنم بھی چھن گیا	۱۲۰
۷۸	میسر اگر لب کشائی نہیں ہے	۱۲۱
۷۹	کروں گر فکر جنت کی تو دنیا جلائے ہے مجھ سے	۱۲۲
۸۰	زخم بھر نہیں سکتے نیم جاں بہاروں سے	۱۲۳
۸۱	کتنے وعدوں کے گھر کتنی تمناؤں کے پھول	۱۲۴

۸۲	جو لوگ رہِ عشق میں ناکام رہے ہیں	۱۲۵
۸۳	زُلف کے روپ میں برسا ہے جو ویرانوں پر	۱۲۶
۸۴	اپنی راہوں سے جو بھٹکا ہوا سیّارہ ہے	۱۲۷
۸۵	موجِ تسنیم کو گرداب نہ ہونے دینا	۱۲۸
۸۶	چشم و گیسو کا کوئی ذکر نہ رخسار کی بات	۱۲۹
۸۷	آنسوؤں کی سبیل ہے یارو	۱۳۰
۸۸	احساسِ شباب ہو چلا ہے	۱۳۱
۸۹	بیانِ یار ہے زیر و زبر سے کیا ہوگا	۱۳۳
۹۰	ہر گیت پہ ہر لے پر چاک اپنا گریباں ہے	۱۳۴
۹۱	نگاہ گل نے ہمیں ایک جواب بھی نہ دیا	۱۳۵
۹۲	ایسے بھی مناظر ہیں کہ رہ جاؤ گے حیراں	۱۳۶
۹۳	دھوپ کی فرمانروائی اور مہ پاروں کے جواب	۱۳۷
۹۴	آرزوؤں کے چمن زار سے آگے نہ بڑھے	۱۳۸
۹۵	عشق کو ناؤ ملی ناؤ کو ساحل نہ ملا	۱۳۹
۹۶	حق گوئی کے مجرم رسن و دار سے بچ جائیں	۱۴۰
۹۷	دوسروں کی عاقبت اور اپنی دنیا کا خیال	۱۴۱
۹۸	محفل میں یہ نظارۂ رسوائی احباب	۱۴۲
۹۹	مشکلوں کو قافلے کا پاسباں رہنے دیا	۱۴۳
۱۰۰	ہم ہو گئے شہید یہ اعزاز تو ملا	۱۴۴
۱۰۱	اب اس سے اسکے قراروں کی بات کون کرے	۱۴۵
۱۰۲	ہر رات جو کرتے ہیں ستاروں کی تجارت	۱۴۶
۱۰۳	سب کچھ بھلا کے آؤ پھر اک بار ہم ملیں	۱۴۷

انتساب

برادرِ عزیز سراج یوسف مرحوم کے نام
جس کے بغیر
"لبِ سحر" نامکمل ہے،

سراج یوسف

وہ ستارۂ شبِ تار تھا جو چمک دکھا کے چلا گیا
وہ چراغِ شہر غبارِ شہر سے تنگ آ کے چلا گیا

جو بہار اس کی نظر میں تھی وہ خزاں کے روپ میں ڈھل گئی
وہ جو دیکھنے میں شراب تھی اسے زہر پا کے چلا گیا

وہ معاشیات کا رازداں وہ ضمیرِ قوم کا پاسباں،
وہ ستم پہ صاد نہ کر سکا تو نظر جھکا کے چلا گیا

یہ مثال صبر و رضا کی ہے یہ دلیل اسکی وفا کی ہے
کہ وطن کو داغ نہ دے سکا دل و جاں لُٹا کے چلا گیا

کبھی بھائی تھا کبھی دوست تھا وہ ہر ایک رنگ میں منفرد
ہمیں اس کا ساتھ نہ دے سکے ہمیں آزما کے چلا گیا

لبِ سحر کے نام

ڈاکٹر قمر رئیس

خالؔد یوسف کی غزل میں ایک باغی کی کج کلاہی، مجاہد کا بانکپن اور مغنّی کی دل نوازی چونکاتی ہے۔ فیضؔ نے غزل میں اجتماعی شعور اور سیاسی فکر کی طرحداری کو جس خوبی سے سمویا ہے۔ خالؔد یوسف نے اس میں دو ایک نئی جہتوں کا اضافہ کرنے کی سعی کی ہے۔ فیضؔ کی رومانیت کبھی کبھی اُن کے سیاسی تجربے کو تحلیل کر کے خالص عشقیہ تجربے میں ڈال دیتی ہے۔ لیکن "لب سحر" کے شاعر کا عشقیہ تجربہ بھی گہرے سیاسی تجربے کی طرح قلب ونظر کو تمازت آشنا کرتا ہے۔ وہ قاری کو کسی خواب گوں فضا کے بجائے کھردری لیکن دلکش وادیوں میں لے جاتا ہے۔

چشم وگیسو کا کوئی ذکر، نہ رُخسار کی بات
بیٹھ کر کیجئے ان سے درو دیوار کی بات

چاندکی صورت نظر آئے تو جاگیں اہلِ دل
بے ضرورت ظلمتوں کے پاسباں ہم بھی نہیں

خالؔد یوسف کی غزل میں زندگی اپنے سارے نور وظلمت کے ساتھ ایک کُل بن کر ابھرتی ہے۔ اسے دائروں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ اس میں کوئی مرکزی نقطہ ہے تو وہ ہے وطن اور خاک بر سر انسانیت سے والہانہ پیار۔ اسی پیار کے دامن سے اس مقدس نفرت کی کرنیں پھوٹتی ہیں جن کا نشانہ اہل اقتدار کی سازشیں اور ظلم وجبر کی بے امان قوتیں ہیں۔ خالد ان سے کہیں مفاہمت کے لیے تیار نہیں ہے۔

مدحِ صیّاد بہرحال ضروری تو نہیں
چُپ رہو یہ بھی ہے اب جرأت کردار کی بات

وہ معتبر نہیں ہے مگر یہ تو دیکھئے!
لایا گیا ہے بیچ میں قرآن کم سے کم

ایسے ان گنت اشعار کتنے ہی ایشیائی منطقوں کے عوام کی انقلابی جد و جہد کا مرقع بن جاتے ہیں۔ وہ ایسے المناک تصادم کا اشاریہ ہیں جو آج کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔

خالدؔ یوسف کی غزلیں ایک ہی نشست میں پڑھیے تو محسوس ہوگا جیسے ان میں ایک جیسے تیور کی تکرار ہے (اس الزام سے فیضؔ کی شاعری بھی بری نہیں) لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس ظاہری تکرار میں ہی شاعر کی قوّت اور شناخت پوشیدہ ہے۔ اس کی غزل کی اپنی ایک فضا ہے۔ خالد نے اپنی تخلیقی ذہانت سے ایک ایسا گلستاں سجایا ہے جس کے پھول ایک جیسے رنگ رکھتے ہیں، لیکن اُن کا تبسّم، اُن کی مہک، اُن کی تازگی اور دلنوازی کے انداز جُدا جُدا ہیں۔

سیاہ شب نے پہن لی ہیں خلعتیں جب سے
گناہ گار ہیں جو پیرہن دریدہ ہیں!!

چند لمحوں کے لیے شب کی بھی سُن لی ورنہ
وہ جو سورج ہے، اندھیروں سے کہیں ہارا ہے

ان اشعار میں سیاہ شب، خلعتیں، پیرہن دریدہ اور سورج جیسے استعارے نئے معنوی سیاق و سباق کے حامل ہیں۔ لیکن خالدؔ یوسف کا کمال یہ ہے کہ وہ کلاسیکی

شاعری کے رموز و علائم سے بھی نئے تناظرات خلق کرتے ہیں۔ شیخ، رند، اظہار، دربان، چارہ گر، سفینہ، گل، گلچیں، رقیب، شمشیر و سناں، جنوں، مصلوب، چاک گریباں اور دوسرے علائم خالد کی غزل میں جاندار اور متحرک بن کر ہم عصر زندگی کے نقش ابھارتے ہیں۔ خالد نئی زمین دریافت کرتے ہیں، نئے حربے آزماتے ہیں تاکہ انہیں جو کہنا ہے، وہ کہہ سکیں۔ اور روایت سے اُن کی وابستگی فرسودگی نہ کہلائے۔ انہیں وہ کرب باطن عزیز ہے جو احساس کی قندیل روشن رکھتا ہے اور روشنیٔ طبع کو جلا بخشتا ہے۔ اُن کی آواز میں ایسی خود آگہی اور لہجے میں کج کلاہی ہے جو باطل کے خلاف مسلسل جنگ کرنے والے مجاہد کا مقدر ہوتا ہے۔ یہ بلند حوصلگی، سرکشی اور بانکپن کاش اُن کے ہر معاصر کا مقدر بن سکے۔

ڈاکٹر قمر رئیس

ایک نئی طرز کا ترقی پسند شاعر

موج فرازی

دیکھا گیا ہے کہ نئی نسل سابقہ نسل کی بہت سی باتوں سے اختلاف رکھتی ہے۔ اور اس نسل میں شاعر اور ادیب بھی ہوتے ہیں۔ اُن کا رشتہ بھی سابقہ نسل کے شعرا اور ادیبوں سے وہی ہوتا ہے۔

کسی نے مجھ سے سوال کیا کہ نئی نسل اور پرانی نسل کا کیا چکر ہے؟۔ دونوں نسلیں آخر انسانوں ہی کی ہوتی ہیں۔ اور اُن کی بنیادی ضرورتیں علیٰ ہذالقیاس مشترک ہوتی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ نئی نسل انسانوں کے کچھ آگے بڑھ جانے کا نام ہے۔ انسان جُوں جُوں آگے بڑھتا ہے منئے نئے مسائل سامنے آتے ہیں۔ اس کی ہزاروں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اس وقت بحث صرف ادب سے ہے۔ جب کائنات کی نئی نئی چیزیں اپنی نئی نئی تبدیل شدہ شکل میں سامنے آتی ہیں تو اپنا خاکہ بھی سابقہ خاکے سے مختلف بناتی ہیں۔ اور فکر کا زاویہ بدل دیتی ہیں۔

دنیا کے کسی بھی زبان کے ادب کو لے لیجئے، کبھی جنگ سے متاثر ہوتا ہے، کبھی آئے دن کی تبدیلیوں سے اپنے آپ کو بے نیاز نہیں رکھ سکتا، اور کبھی نئی خواہشات اور ضروریات کو بروئے کار لانے کے لیے اسے اپنا لہجہ بدلنا پڑتا ہے۔ یہ سب تبدیلیاں ادب میں کسی سوچے سمجھے فارمولے کے تحت نہیں بنائی جاتیں، بلکہ خود بخود ہی پیدا ہو جاتی ہیں۔

خالد یوسف نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ بدلے ہوئے اندازِ فکر کا حامل ہے۔ اس نے تو آنکھ کھولتے ہی اپنے چاروں طرف یہ مناظر دیکھے اور اسی زمانے

کے شعرا اور ادیبوں کو پڑھا ۔ اس کے دل و دماغ میں اور عنصر کہاں سے آتا ؟ ۔
اسی دنیا میں اور اسی دنیا کی اس نے نظمیں ،غزلیات اور قطعات کہے ۔
ملاحظہ کیجئے !

دیکھو تو ہر ایک شے پہ بہاروں کی پھبن ہے
سوچو تو وہی سلسلۂ دار و رسن ہے !!
ہم چاک گریبانوں کو ہنس ہنس کے نہ دیکھو
اس بزم میں خلعت بھی عطا ہو تو کفن ہے

اب پھول کو حاصل ہے، نہ بلبل کو میّسر !
صیّاد کے چہرے پہ جو بے ساختہ پن ہے

خالدؔ یوسف نے محسوس کیا کہ کسی زمانے میں صاف گوئی ایک حُسن تھا اور معیار کے بلند رکھنے کا ایک باوقار ذریعہ ۔ مگر اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک جس میں وہ اب سانس لے رہا ہے ۔ ایک بیکار حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں ۔
خالدؔ یوسف کو شدّت سے اس بات کا احساس ہے کہ ریاکاری اب ادب میں بھی حُسن بنتی جارہی ہے چنانچہ اسی تاثر نے اس سے یہ شعر کہلوایا ۔

پڑھیے نہ غزل داد کی اُمید میں خالدؔ
یہ صاف بیانی تو خوشامد ہے نہ فن ہے

اصل میں خالدؔ یوسف کی شاعری علامتی شاعری ہے جو اس زمانے کی دین ہے اور سب سے پہلے فرانس میں اپنائی گئی ۔ جہاں تک ہوسکا ہے ، خالدؔ یوسف نے اپنے کلام میں اس سے کام لیا ہے ۔ اس نے روایات سے بھی رشتہ نہیں توڑا ہے ۔

بلکہ کچھ ایسا رویہ اختیار کیا ہے۔ جس نے اس کے اشعار میں اس کی خواہش کے مطابق پسِ منظر پیش کیا ہے جو یقیناً آسان کام نہیں ہے۔

اب شہر میں باقی کوئی مریم ہے ۔ نہ عیسیٰؑ !
دل کس کی مسیحائی پہ بیمار ہوا ہے

بزمِ اغیار اگر ہو تو بچھے جاتے ہیں !!
اور کرتے ہیں وہ ہم سے رسَن و دار کی بات

ہم اپنی آبلہ پائی پہ کیوں نہ ناز کریں !!
کہ اب ہمارے سوا کوئی پاپیادہ نہیں

سحر ہوئی بھی تو شاید ہمیں رہیں مصلوب
وہ تیرگی ہے دلوں میں، سحر سے کیا ہوگا؟

میں نے خالد یوسف کا پہلا مجموعہ کلام پڑھا تو اس کی عظمتوں نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ خیال کیا کہ وہ نظم کا شاعر ہے اور جب اس کی غزلیں دیکھیں تو یہ فیصلہ بدلنا پڑا۔ یہی نہیں، اس کے قطعات پڑھ کر تو اسے اختر انصاری (دہلوی) کی صف میں کھڑا کرنے کو جی چاہا اگرچہ دونوں کا انداز مختلف ہے۔

شاید یہی اس کی شاعری کا حُسن بھی ہے کہ جس صنف میں بھی اس نے کہا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے لیے پیدا ہوا ہے۔

کبھی کبھی تو میں نے یہ بھی سوچا کہ ایسے رائج الوقت افکار کا حامل آکسفورڈ میں انقلابِ زمانہ کی نذر ہو رہا ہے اور "ہر چہ در کانِ نمک رفت نمک شد" والی بات

کہیں اُس پر صادق نہ آجائے ۔ مگر ایسا نہیں ہے ۔ وہاں رہ کر بھی اس نے اپنا وجود تسلیم کرالیا ہے ۔ آکسفورڈ سے پندرہ روزہ "جمہور" کو جنم دیا ہے ۔ اور اپنے ہم نواؤں کا ایک اچھا خاصا گروپ پیدا کرلیا ہے اور یہ سب کر چکنے کے بعد، اس کا اظہار بھی ان اشعار میں کردیا ہے۔

مشکلوں کو قافلے کا پاسباں رہنے دیا
جذبۂ منزل کو میرِ کارواں رہنے دیا

لالہ رُخ ، نسریں بدن سب کی جوانی ڈھل گئی
ہم نے اپنی حسرتوں کو نوجواں رہنے دیا

سبزہ و برگ و گُل و بُلبُل پہ آنچ آنے نہ دی
بجلیوں کی زد میں اپنا آشیاں رہنے دیا

خالد یوسف نے جب آنکھ کھولی شاعری میں حسرت ، جوش ملیح آبادی ، جگر مرادآبادی ، حفیظ جالندھری ، فراق گورکھپوری ، فیض احمد فیض ، ن ۔ م ۔ راشد ، دل شاہجہانپوری ، مجاز ، سجاد ظہیر ، جان نثار اختر ، معین احسن جذبی ، اختر شیرانی ، اختر انصاری ، احسان دانش ، اختر الایمان ، تلوک چند محروم ، ذنا ثریا کیفی ، حیدر دہلوی ، رئیس امروہوی ، راز مرادآبادی ، شکیل بدایونی ، مجروح سلطانپوری ، ساحر لدھیانوی ، ظہور نظر اور قیوم نظر وغیرہ وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند اپنے عروج پر تھے ۔ یہ ناممکن تھا کہ خالد یوسف اپنے آس پاس کے ہم عصر سینئر ادیبوں اور شاعروں کو نہ پڑھتا ۔ لیکن خالد یوسف کا کمال یہ ہے کہ اپنے اوپر کسی قسم کا لیبل نہیں لگایا بلکہ آزاد رہنا زیادہ پسند کیا ۔ اور اسی کے الفاظ ہیں جو

یہاں نقل کر رہا ہوں۔
"ہمارا کوئی گروپ ہے نہ پارٹی، نہ سیاسی نہ ادبی، لگی بندھی پارٹی لائن ہم نے کبھی قبول نہیں کی۔ البتہ جس بات کو حق سمجھا اس بات کی حمایت ڈنکے کی چوٹ کرتے رہے"
اس کے یہ الفاظ واضح کرتے ہیں کہ وہ حقیقی ترقی پسند ہے مگر اس سے کوئی ذاتی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔
چند اشعار غور طلب ہیں۔

تم مجھے شعر سنانے پہ نہ مجبور کرو
رسن و دار کا قصّہ ہو بہت ممکن ہے

صیّاد کے پنجے میں اگر کوہ و دمن ہوں!
جھرنوں کا ترنم بھی ہے زنجیر کی جھنکار

یہ نہیں ہے کہ موقع پرست اس کی نظر میں نہ رہے ہوں۔

ہیں آج کچھ اغیار بھی محفل میں تو غم کیا
کچھ روز تو کعبے میں بھی اصنام رہے ہیں

قنوطیت اور فرار اس کی زندگی میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے اس کی شاعری میں بھی اس کی جگہ نہیں ہے۔ اس میں اپنے دل کو بہلانے کی پوری صلاحیت ہے۔ ایسے اشعار اس کے کلام میں بہت ملیں گے۔

سب کچھ بھلا کے آؤ پھر ایک بار ہم ملیں
ممکن ہے اس کے بعد یہ لمحے بھی کم ملیں

یہ سوچ کے گلشن سے چلے آئے ہیں خالدؔ

ممکن ہے کوئی پھول سا چہرہ نظر آئے

قدم قدم پہ جلاتے رہو چراغِ اُمید !
کہ اس سفر میں ستاروں کا اعتبار نہیں
چلے چلو تو اُگ آئیں گے خونِ پا سے گلاب
کہ اب چمن میں بہاروں کا اعتبار نہیں

خالد یوسف کے کلام میں ایک اور بھی خصوصیت ہے کہ اس کے اشعار میں انقلاب کی گھن گرج ہی نہیں بلکہ محبوب کی خاموش یاد بھی ہے۔ پھولوں کی مہک بھی ہے اور آواز کی غنائیت بھی ۔ وہ زندگی کے تمام حقائق کو بہ حقہ تسلیم کرتا ہے ۔

دھوپ کی فرمانروائی اور مہ پاروں کے خواب
سخت جان ہیں ہم چُن لیتے ہیں انگاروں کے خواب

یا یں ہجوم بہاراں تلاش ہے اس کی
وہ اک بہار جو پابند ماہ و سال نہیں

کوئی کیسے ان کو خفا کرے، کوئی کیسے ترکِ وفا کرے
کبھی پھول ہے، کبھی چاند ہے رُخِ یار سے تو مفر نہیں

خالد یوسف نے غزل کے لہجے کو اس طرح تبدیل کیا ہے جس طرح اپنے مکان میں کوئی وارنش کا رنگ بدل دے اور وہ از سرِ نو بدلا ہوا دکھائی دینے لگے۔ اب ان اشعار ہی کو لے لیجئے ، بات نئی نہ ہونے کے باوجود جس انداز سے کہی گئی ہے، اُس

نے لطف دوبالا کر دیا ہے۔

خالدؔ جنہوں نے ہم کو رُلایا تمام عمر
خلوت میں جھانکئے تو وہ آنکھیں بھی نم ملیں

زلفوں کی چھاؤں، ہونٹوں کی سُرخی، بدن کی دھوپ
خالدؔ ہمارے شعر کا انعام کچھ تو ہو

ہو جائے گا وہ بھی تو امر ہم کو جلا کر
شعلے کا مقدّر ہے جو بیدار ہوا ہے

لوگ کہتے ہیں کہ خالدؔ یوسف، غالبؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور مجازؔ سے زیادہ متاثر ہے۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ وہ زمانے سے متاثر ہے۔ جب وہ شعر کہتا ہے تو صرف زمانہ ہی اس کی نظر میں ہوتا ہے اور صرف وہ خود ہوتا ہے۔ ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

اپنی عظمت نہ سہی حق کی حفاظت کے لیے
جنگ کعبے میں، صنم خانوں میں لڑنا ہو گی!

رقص وطرب کے دیس میں آہ و بکا کا شور ہے
کانپ رہے ہیں آبشار، چیخ رہی ہیں ندیاں

قطعہ

گریاں ہیں آبشار ترنم بھی چھن گیا
موجیں اداس ہیں کہ تلاطم بھی چھن گیا

اب کے برس کمالِ بہاراں تو دیکھئے !!!
پھولوں سے اختیارِ تبسّم بھی چھن گیا

احباب کی قلت بھی گوارا ہے مگر ہم !
دُگّی سے جو کٹ جائیں وہ اِکّے نہیں رکھتے
معیارِ وفا آج بھی غربت ، نہ امارت
کھوٹے ہوں تو ہم جیب میں سکے نہیں رکھتے

خالدؔ یوسف کے کلام میں تعلی اور مبالغہ آرائی نام کو نہیں ملے گی اور اگر کہیں ملی بھی تو اس حد تک جسے دل قبول کرلے اور دماغ اس سے انحراف نہ کرے۔ مثلاً جب انسان چاند کی دنیا میں پہنچ گیا تو اس نے یہ قطعہ محض اس بات کا اظہار کرنے کے لیے کہا کہ وہ اپنے محبوب کو کتنا اعلیٰ مقام دیتا ہے۔ گویا چاند پر پہنچنے والوں کو اپنا رقیب سمجھتا ہے۔

پہنچ گئے ہیں قدم چاند پر بھی یاروں کے
میں سوچتا ہوں تجھے چاند سا کہوں، نہ کہوں
لگے ہوئے ستاروں کی تاک میں کچھ لوگ
میں کہکشاں کو تری گردِ پا کہوں نہ کہوں !

آخر میں مجھے ایک بات اور کہنی ہے۔ وہ یہ کہ خالد یوسف نے رسن و دار اور زمانے کا انقلاب اس لیے قبول کیا ہے کیونکہ وہ گلستاں کے لیے بہار لانا چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مشکل اور دشوار گذار راستوں کے لیے ایک خاص سرور کی ضرورت ہے۔ بغیر توانائی کے مسافر راستے میں ڈھیر ہو جاتا ہے اور

منزل نہیں آتی ۔ اس انداز کی شاعری کا متقدمین میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ متاخرین میں بھی اس انداز سے ذرا کم ہی ملے گی۔ یہ قطعات پڑھیے اور خالد یوسف کی سچائی ، ایمانداری اور انصاف کی داد دیجئے ۔

قطعہ

قدم قدم پہ بچھائے گئے ہیں خار مگر !!
نہیں جھکیں گے قدم بوسئ خزاں کے لیے
ہزار خطرۂ صیّاد ، لاکھ قید و قفس !
بہار ڈھونڈ کے لانا ہے گلستاں کے لیے

قطعہ

عقل سے برسرِ پیکار نہیں ہیں ہم لوگ
دشمنِ گیسو و رخسار نہیں ہیں ہم لوگ
زیست کو زیست بنانے کے لیے نکلے ہیں
زندگی سے کوئی بیزار نہیں ہیں ہم لوگ

بات سے بات

سیّد عاشور کاظمی

- خالد یوسف میرا دوست'
- خالد یوسف کیسا شاعر ہے ؟ ۔
- وہ اچھا شاعر تو ہو سکتا ہے لیکن فی زمانہ مشہور شاعر نہیں'

آج سے کم و بیش بائیس سال پہلے کی بات ہے ،

کراچی میں میرے ایک صاحب ثروت دوست ایک انکم ٹیکس افسر سے ملنے جارہے تھے کہ ان کی کار خراب ہوگئی ۔ انہیں سواری نہیں مل رہی تھی ۔ کراچی میں اُن دنوں بھی رکشہ ٹیکسی کا ملنا دشوار تھا اور سُنا ہے کہ آج بھی یہ مسئلہ جوں کا توں ہے بلکہ غالباً اور زیادہ پریشان کُن ہو گیا ہے ۔ میں اُدھر سے گذرا تو موصوف میری گاڑی میں سوار ہو گئے ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ میرے سر پر سوار ہو گئے ۔ یہ انکم ٹیکس افسر میر پور خاص (سندھ) میں تعینات تھے اور کراچی آئے ہوئے تھے ۔ موصوف اپنے کسی عزیز کی سفارش کے لیے جارہے تھے ، جو میر پور خاص میں تھے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسلامی دور کے انکم ٹیکس افسروں سے ملنے کے کیا آداب ہیں ۔ اُس غیر اسلامی دور کے افسران تک رسائی کے آداب کا مجھے اندازہ تھا ۔ لہذا میں جانا نہیں چاہتا تھا ۔ خصوصاً جب یہ معلوم ہوا کہ ان انکم ٹیکس افسر سے موصوف کی پہلے سے شناسائی بھی نہیں تھی ۔ لیکن بہر حال مجھے جانا پڑا ۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انکم ٹیکس افسر نے ان حضرت کی باتوں کو بڑے تحمل سے سنا اور بڑے نرم لہجے میں کہا" مجھے افسوس ہے کہ میرے عملے کی کوتاہی

سے آپ کے عزیز کو تکلیف پہنچی۔ اُن سے کہیے وہ مجھ سے مِل لیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اُن کے ساتھ انصاف ہوگا"۔ انکم ٹیکس افسر نے ہمیں چائے بھی پلائی اور صاحب معاملہ کو علیحدہ لے جاکر کوئی بات بھی نہ کی۔ اُن کا یہ روّیہ، آدابِ افسری کے بھی خلاف تھا اور 'اطمینانِ سائل' کے لیے بھی ناقابلِ یقین۔ لیکن میں اس انکم ٹیکس افسر سے بے پناہ متاثر ہوا تھا۔ تقریباً دو ہفتے بعد انہی دوست نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ ان کے عزیز کا انکم ٹیکس والا معاملہ واقعی انصاف کے اصولوں کے تحت طے پا گیا تھا لیکن موصوف اس بات پر بہت پریشان تھے کہ کام کرنے کے بعد بھی وہ انکم ٹیکس افسران سے 'دوسری' ملاقات پر آمادہ نہیں تھے۔

کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ یہ انکم ٹیکس افسر 'خالد یوسف' شاعر بھی تھے اور میرے ایک بہت ہی محترم، بہت ہی پیارے دوست اور کرم فرما اقتدار خان (علیگ) المعروف 'درّو بھیا' کے عزیز بھی تھے۔

یہ تھی خالد یوسف سے میری پہلی ملاقات، اس دوہرے تعلق کی بناء پر میرا اُن سے لگاؤ لازمی تھا۔

اُس کے بعد ملاقاتیں تو کم رہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہے۔ کبھی کبھار خالد یوسف کے اشعار سننے کا موقع بھی ملا۔ لیکن وہ سندھ میں تھے اور میں کراچی میں۔ البتہ جب بھی کہیں خالد یوسف کا ذکر آتا تو ایک بات میرے لیے حیرت اور پریشانی کا باعث ہوتی کہ یہ انکم ٹیکس افسر ہے جس کا کلام مقامی اخبارات کے صفحہ اوّل پر مناسب اور غیر مناسب تعریفی کلمات کے ساتھ شائع نہیں ہوتا۔ اس کی تصویریں نہیں چھپتیں، یہ شخص مشاعروں کی صدارت بھی نہیں کرتا۔ آخر کیا ہوگیا ہے اہلِ ذوق کو۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ 'باذوق' کاروباری لوگ اور مدیرانِ جرائد ہر وقت اس کے دفتر میں جمع رہتے۔ اور اس کی شاعرانہ عظمت کے گُن گاتے نظر آتے۔ ہر ماہ نہیں تو کم از کم سال میں تین چار

شعری مجموعے خالدؔ یوسف کے نام سے شائع ہوتے۔ لیکن ان کے دفتر میں تو کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ خالدؔ یوسف شاعر ہے۔ اور اکثر اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ خالدؔ یوسف شاعر نہیں یا انکم ٹیکس افسر نہیں۔ معاف کیجیے میں غلط کہہ گیا۔ انکم ٹیکس افسر کا شعری مجموعہ شائع ہونے کے لئے اس کا شاعر ہونا ضروری نہیں۔ اس کے لیے شاعر کہلانے کی خواہش ہی کافی وشافی ہے۔ خالدؔ یوسف کا کلام تزک واحتشام کے ساتھ شائع نہ ہونے کا ایک ہی سبب ممکن تھا کہ وہ انکم ٹیکس افسر نہیں۔

اور پھر جب ۱۹۷۰ء میں معلوم ہوا کہ خالدؔ یوسف کا پہلا مجموعۂ کلام شائع ہو گیا ہے تو ذہن میں خیال آیا کہ چار پانچ صد صفحات کا ضخیم دیوان ہوگا۔ چمڑے کی جلد پر سنہری حروف میں مجموعہ کا نام اور خالدؔ یوسف کا اسم گرامی لکھا ہوگا۔ شہر کے کسی بڑے کلب یا سب سے بڑے ہوٹل میں اس کی رونمائی ہوگی۔ ملک کے نہیں کم از کم شہر کے اخبارات میں خالدؔ یوسف کی تصاویر شائع ہوں گی۔ لیکن ایک بار پھر مایوسی ہوئی۔ سادہ سے انداز میں "حسرت گفتار" کے نام سے خالدؔ یوسف کا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ نہ پی۔ آر کا شور، نہ دیباچوں کی بیساکھیاں، نہ اخبار نویسوں کا ڈنر، نہ ڈھول تاشے۔ لیکن یہ پہلا بھرپور تعارف تھا ادبی دنیا سے انکم ٹیکس افسر خالدؔ یوسف کا نہیں، شاعر خالدؔ یوسف کا۔

خالدؔ یوسف اس دور میں ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ "حسرت گفتار" پر محترم الیاس عشقی نے بڑی محبت سے دیباچہ لکھا تھا۔ مجازؔ، جاں نثار اخترؔ، اخترؔ شیرانی، احسان دانشؔ ایسے شعرا کا ذکر کرتے ہوئے الیاس عشقی نے لکھا تھا کہ خالدؔ کے ہاں مجازؔ کی سریلی آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن خالدؔ کی نظمیں ان کی بازگشت نہیں۔ جاں نثار اخترؔ کا آہنگ تو ہے لیکن انداز جداگانہ۔ کہیں کہیں لہجہ دانشؔ کا ہے مگر جذبہ اور احساس خالدؔ کا اپنا ہے۔ اس طرح خالدؔ یوسف کا کلام پڑھنے والوں کو تمام رومانی شاعری کا آہنگ، لہجہ

اور آواز تو سنائی دی لیکن ایک نئے تیور کے ساتھ، ایک نئے اسلوب کے ساتھ۔

میں نے ادب کے طالبعلم کی حیثیت سے جب "حسرتِ گفتار" کو پڑھا تو ہر چند کہ میرے پاس محترم الیاس عشقی کی بالغ نظری تھی نہ دور بینی اور خورد بینی مگر میرے لیے اس سمت کا تعین کرنا مشکل نہ تھا جس طرف خالد یوسف گامزن تھے۔ میں گل کی شگفتگی کے پس پردہ اس کے جگر کے داغ دیکھ رہا تھا۔

ایک دن میں نے درّو بھیا سے کہا "مجھے تو آپ کے خالد یوسف اپنے ہم مذہب نظر آتے ہیں۔" میری مراد خالد کی ترقی پسند فکر سے تھی جو مجھے اُن کے اشعار میں نظر آئی تھی۔

جیب اور دل کی کشاکش میں گرفتار ہے رات

امن کے خواب رسیلے ہیں، سہانے ہیں مگر
دہر میں آج بھی طاقت کے سوا کچھ بھی نہیں

قدم قدم پہ جفاؤں کے سلسلے ہیں مگر
تیرے وجود سے یہ شہر خوبصورت ہے

لیکن اس شب کی ایک ایک گھڑی
صبحِ نو کی دلیل ہے یارو !!!

دل میں دیارِ یار کی اب یاد بھی نہیں
کتنا سجا ہوا درِ زنداں ہے آج کل !

شعری مجموعے خالد یوسف کے نام سے شائع ہوتے۔ لیکن ان کے دفتر میں تو کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ خالد یوسف شاعر ہے۔ اور اکثر اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا کہ خالد یوسف شاعر نہیں یا انکم ٹیکس افسر نہیں۔ معاف کیجئے میں غلط کہہ گیا۔ انکم ٹیکس افسر کا شعری مجموعہ شائع ہونے کے لیئے اس کا شاعر ہونا ضروری نہیں۔اس کے لیے شاعر کہلانے کی خواہش ہی کافی وشافی ہے۔خالد یوسف کا کلام تزک و احتشام کے ساتھ شائع نہ ہونے کا ایک ہی سبب ممکن تھا کہ وہ انکم ٹیکس افسر نہیں۔

اور پھر جب ۱۹۷۱ء میں معلوم ہوا کہ خالد یوسف کا پہلا مجموعۂ کلام شائع ہوگیا ہے تو ذہن میں خیال آیا کہ چار پانچ صد صفحات کا ضخیم دیوان ہوگا۔ چمڑے کی جلد پر سنہری حروف میں مجموعہ کا نام اور خالد یوسف کا اسم گرامی لکھا ہوگا۔ شہر کے کسی بڑے کلب یا سب سے بڑے ہوٹل میں اس کی رونمائی ہوگی۔ ملک کے نہیں کم از کم شہر کے اخبارات میں خالد یوسف کی تصاویر شائع ہوں گی۔ لیکن ایک بار پھر مایوسی ہوئی۔ سادہ سے انداز میں "حسرت گفتار" کے نام سے خالد یوسف کا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ نہ پی۔آر کا شور، نہ دیباچوں کی بیساکھیاں، نہ اخبار نویسوں کا ڈنر، نہ ڈھول تاشے۔ لیکن یہ پہلا بھرپور تعارف تھا ادبی دنیا سے انکم ٹیکس افسر خالد یوسف کا نہیں، شاعر خالد یوسف کا۔

خالد یوسف اس دور میں ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے۔
'حسرت گفتار' پر محترم الیاس عشقی نے بڑی محبت سے دیباچہ لکھا تھا۔ مجاز، جاں نثار اختر، اختر شیرانی، احسان دانش ایسے شعرا کا ذکر کرتے ہوئے الیاس عشقی نے لکھا تھا کہ خالد کے ہاں مجاز کی سریلی آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن خالد کی نظمیں ان کی بازگشت نہیں۔ جاں نثار اختر کا آہنگ تو ہے لیکن انداز جدا گانہ۔ کہیں کہیں لہجہ دانش کا ہے مگر جذبہ اور احساس خالد کا اپنا ہے۔اس طرح خالد یوسف کا کلام پڑھنے والوں کو تمام رومانی شاعری کا آہنگ، لہجہ

اور آواز تو سنائی دی لیکن ایک نئے تیور کے ساتھ، ایک نئے اسلوب کے ساتھ۔
میں نے ادب کے طالبعلم کی حیثیت سے جب "حسرتِ گفتار" کو پڑھا تو ہر چند کہ میرے پاس محترم الیاس عشقی کی بالغ نظری تھی نہ دور بینی اور خورد بینی مگر میرے لیے اس سمت کا تعین کرنا مشکل نہ تھا جس طرف خالد یوسف گامزن تھے۔ میں گل کی شگفتگی کے پس پردہ اس کے جگر کے داغ دیکھ رہا تھا۔
ایک دن میں نے درّو بھیا سے کہا "مجھے تو آپ کے خالد یوسف اپنے ہم مذہب نظر آتے ہیں۔" میری مراد خالد کی ترقی پسند فکر سے تھی جو مجھے ان کے اشعار میں نظر آئی تھی۔

جیب اور دل کی کشاکش میں گرفتار ہے رات

امن کے خواب رسیلے ہیں، سہانے ہیں مگر
دہر میں آج بھی طاقت کے سوا کچھ بھی نہیں

قدم قدم پہ جفاؤں کے سلسلے ہیں مگر
تیرے وجود سے یہ شہر خوبصورت ہے

لیکن اس شب کی ایک ایک گھڑی
صبحِ نو کی دلیل ہے یارو !!!

دل میں دیارِ یار کی اب یاد بھی نہیں
کتنا سجا ہوا درِ زنداں ہے آج کل !

ابھی سے ٹوٹ رہا ہے خمارِ ظلمتِ شب !
ابھی کیا ہے سحر کا فقط بیاں میں نے

کہوں ایک بات کھل کر تو ہزار تازیانے
یہ غزل نہیں ہے خالدؔ، میری طرزِ گفتگو ہے

درّو بھیّا کو خالد کے کچھ شعر سنائے تو مسکرا کر کہنے لگے۔" میاں پوری انسانیت پر برا وقت ہے، اس غریب پر آ گیا تو کیا ہوا ۔" درّو بھیّا نے تو یہ بات از رہِ مذاق کہی تھی لیکن میں واقعی سوچنے لگا۔ کہ انسانیت پر جو بُرا وقت ہے۔ اس" رومانی شاعر" کو کس حد تک اس کا ادراک ہے۔

" حسرتِ گفتار" میں بقول خالدؔ یوسف ان کے طالبعلمی کے زمانے کی شاعری تھی۔ مجموعہ کی اشاعت کے بعد کئی بار جی چاہا کہ خالدؔ یوسف سے اس پر تفصیلی بات ہو۔ میں خالدؔ سے کھل کر پوچھنا چاہتا تھا کہ حرّیت پسند گھرانے کے اس روہیلکھنڈی شاعر کے اشعار میں کہیں کہیں جو کاٹ ہے وہ شعوری ہے یا ان کی فطری شاعرانہ صلاحیتوں کا اعجاز۔ اس لیے کہ میری نظر میں بعض ایسے معتبر شعراءِ کرام تھے (آج بھی بہت سے ہیں) جو ترقی پسندانہ یا یوں کہوں کہ زندگی کے مسائل سے متعلق اشعار فیشن کے طور پر کہتے تھے۔ ہر چند کہ ایسے اشعار میں لفاظی یا شکوہ لفظی کے باوجود جذبہ کا فقدان ہوتا ہے۔ مگر عام قاری اس سحر کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن مجھے خالد سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ میں اس زمانے میں بوجوہ ادبی دنیا سے ذرا الگ رہتا تھا۔ یہ دور میرے ملک کی مختصر جمہوریت کا دور تھا یا یوں کہوں کہ یہ وہ دور تھا جب ہم جمہوریت کے تجربے سے گزر رہے تھے۔ برسوں کی سیاسی بے راہ روی کے بعد جمہوریت کا سورج طلوع ہوا تھا۔ ایسے تمام لوگ جو تھوڑے ہی عرصہ پہلے جمہوریت کے نعرے لگاتے ہوئے

سڑکوں پر نکل آئے تھے، اب دم بخود تھے اور خالد یوسف کے ایک شعر کی تفسیر بنے ہوئے تھے۔

مدحِ صیاد بہرحال ضروری تو نہیں
چپ رہو یہ بھی ہے اب جرأت کردار کی بات

جمہوریت کے قافلے کا رُخ ناپسندیدہ منزلوں کی طرف موڑنے کے لیے ریشہ دوانیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اور مجھ ایسے لاکھوں آزادیٔ گفتار کے متوالے اس امید پر چپ تھے کہ تجرباتی دور کی کوتاہیاں آخر کار دُور ہو جائیں گی۔ اس لیے کہ جمہوریت کی کمزوریاں اور تکالیف آمریت کی آسودگی سے بہر صورت بہتر ہوتی ہیں۔ لیکن تجربہ کا سورج گہنا گیا اور اندھیرا چھا گیا۔ لوگ اندھیرے سے زیادہ سورج کا محاسبہ کر رہے تھے۔ ان اسباب کے تجزیے میں الجھے ہوئے تھے جو سورج گرہن کا سبب تھے اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ انہی دنوں میں لندن چلا آیا۔

آج سے تقریباً چھ سال پہلے کی بات ہے کہ اچانک ایک مشاعرہ میں ایک ایسے شاعر کا نام پکارا گیا کہ میری رُوح کے تار جھنجھنا اٹھے۔ یہ تھا خالد یوسف کا نام۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ خالد یوسف لندن میں ہیں۔ خالد یوسف نے اسٹیج پر آ کر مائک سنبھالا۔ وہی زیرِ لب مسکراتا خالد یوسف۔ وہی درد بھرا والا خالد یوسف۔ وہی خالد یوسف جسے لوگ رومانی شاعر کہتے تھے لیکن جس کے دل میں آج سے بیس بائیس سال پہلے مجھے چنگاریاں اڑتی نظر آتی تھیں۔ خالد یوسف نے غزل پڑھی۔

اس کا نہیں یہ تختِ سلیماں کم سے کم
اتنا تو جانتا ہے وہ نادان کم سے کم

وہ معتبر نہیں ہے، مگر یہ تو دیکھئے
لایا گیا ہے بیچ میں قرآن کم سے کم

ہر ایک سر گنوائے ضروری نہیں مگر
ثابت رہے نہ کوئی گریباں کم سے کم

خالد نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ دوسری غزل کی فرمائش ہوئی تو خالد غزل سرا ہوئے۔

ساحل سے تو سو بار کیا اس نے کنارا
اب یہ نہ کہیں ہو کہ سفینہ ہی گنوا دے

کیوں باغِ تمنا میں ہر اک مہر بلب ہے
اس چُپ کا ثمر موت ہے کوئی تو صدا دے

ہر چند کہ یہ رات قیامت کی ہے خالد
ممکن ہے یہی صبح بہاراں کا پتا دے

چنگاریاں شعلے بن چکی تھیں۔ خالد یوسف کے سفر کی داستاں چند اشعار نے سُنادی تھی۔ "حسرت گفتار" سے "لب سحر" تک کا فاصلہ خالد نے آنکھیں بند کر کے طے نہیں کیا تھا بلکہ ہر ہر قدم مشاہدات کی آنچ نے اس کی فکر کو جلا دی۔ خالد یوسف ملے تو برسوں کے فاصلے سمٹ گئے اور پھر ملاقاتیں مسلسل ہو گئیں۔ اب میری فکر بھی واضح تھی اور خالد یوسف کی شاعری بھی۔ اب مجھے خالد سے کچھ بھی نہیں پوچھنا تھا۔ بزرگ شاعر محترم موج فرازی نے خالد کے حوالے سے لکھا ہے۔

"ہمارا کوئی گروپ ہے نہ پارٹی۔ سیاسی نہ ادبی۔ لگی بندھی پارٹی لائن ہم نے کبھی قبول نہیں کی۔ البتہ جس بات کو حق سمجھا اس کی حمایت ڈنکے کی چوٹ کرتے رہے۔"

مجھے نہیں معلوم خالد یوسف نے یہ بات کب کہی اور کس سیاق و سباق میں کہی۔ اس لیے کہ اہم باتوں کو پورے تناظر میں دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ خالد نے اگر یہ بات

کہی بھی ہے تو اس کا مقصد یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ سیاست میں یا ادب میں ذاتی دھڑے بندیوں سے الگ ہے لیکن اس سے یہ مراد بالکل نہیں ہو سکتی کہ خالد ادبی یا نظریاتی ہم آہنگی، یک جہتی یا گروہ بندی سے باہر ہے ۔ ایک واضح نقطۂ نظر، واضح فکر، واضح سمت اور منزل کی آگہی رکھنے والا فنکار اگر صداقت کی حمایت کرتا ہے تو وہ ایک گروہ میں تو شامل ہے ، صداقت پسندوں کے گروپ میں ۔ خالد جس فکر کا شاعر ہے وہ اپنی جگہ پر ایک گروپ یا گروہ تو ہے ۔ انسانیت پسندوں کا گروہ حق بات کرنے والوں کا گروہ ۔ ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنانے والوں کا گروہ ، مظلوم کا حامی گروہ ، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کا گروہ ۔ خالد یوسف کمزور نہیں ، بزدل بھی نہیں ، منافق بھی نہیں ، مصلحت پرست بھی نہیں ۔ لہذا موج فرازی صاحب کا مقصد یہ بالکل نہیں ہو سکتا کہ خالد تنہا کھڑا ہے ، آزاد ہے ، نہ وہ کسی کے ساتھ ہے اور نہ کوئی اس کے ساتھ ۔ اس کے برعکس خالد پوری تحریک میں ہمارے ساتھ ہے اور نظریات کے رواں دواں قافلے میں شریک ہے ۔ حضرت موج فرازی کی اپنی زندگی کے تجربات کے بعد ان سے زیادہ کون اس صداقت سے آگاہ ہو گا کہ نام نہاد غیر جانبداری ، مصلحت کیشی کا نام ہے ، اور مصلحت کیشی اور ریاکاری کی سرحدیں ملتی ہیں ۔ وہ انسان جو اپنے کردار کی تعمیر میں واضح فیصلے نہیں کرتا اور واضح لائحہ عمل اختیار نہیں کرتا ، وہ اِدھر کا رہتا ہے نہ اُدھر کا ۔ خالد میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور قوت بھی ہے اور اس کا اعلان کرنے کی ہمت بھی ۔ دنیا میں ازل سے دو قوتوں میں تصادم جاری ہے ۔ حق و باطل ، صدق و کذب ، ظالم اور مظلوم ۔ خالد اس ٹکراؤ اور اس کے نتائج سے بخوبی آگاہ ہے ۔ وہ قدم قدم پر اس کا اعلان بھی کرتا ہے اور ظلم کی نشاندہی بھی ۔

میّسر اگر لب کشائی نہیں ہے !!
اسیری سے بہتر رہائی نہیں ہے

ہم ہوگئے شہید ، یہ اعزاز تو ملا
اہلِ جنوں کو نقطۂ آغاز تو ملا !!

صیّاد کے پنجے میں اگر کوہ ودمن ہوں!
تجھ تک نوں کا ترنّم بھی ئے زنجیر کی جھنکار

خالدؔ زندگی کا شاعر ہے ۔ اس کا نقطۂ نظر بہت واضح ہے ۔ وہ عشق کے خواب آور ماحول میں بیٹھ کر بھی زندگی کے حقائق کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر لیتا ۔ خالد کی شاعری میں غزل کی روایت کی پاسداری ہے ۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ وہ رومانی شاعر ہے لیکن اس کی رومانی فکر مسائل سے لاتعلق نہیں رہتی بلکہ مسائل کا ادراک اس کے رومان کا راستہ روکے نظر آتا ہے ۔

دل گیسوئے جاناں سے بھی بیزار ہوا ہے
گلشن میں وہ جشنِ رسَن ودار ہوا ہے

روایت کی پاسداری خالد نے ہی نہیں تمام ترقی پسند شعراء نے کی ہے۔ ماضی کی بہت سی علامتیں ترقی پسند شاعروں نے اپنائی ہیں لیکن انہوں نے ان علامات کو اپنے مشاہدات اور احساس سے نئے معنی عطا کیے ہیں ۔ خالد نے بھی بہت سی علامتوں کو اپنایا ہے اور دیگر ترقی پسند شعراء کی طرح وہ بھی ان علامتوں کے مروّجہ معنی کے سامنے سرنگوں نظر نہیں آتا بلکہ انہیں نئے معنی کی خلعت فاخرہ پہناتا ہے جس کا اسے احساس بھی ہے اور ادراک بھی ۔

صحرائے سخن میں ہیں جو ہم ابر گہر بار
بے چین ہیں چڑھتے ہوئے سورج کے پرستار

جناب شیخ سے چھیڑ چھاڑ تو ہر دور کے شعراء نے کی ہے مگر خالد کے ہاں شیخ کی ذات اور شیخ کے کردار کے کئی اور پہلو نکلتے ہیں، جو آج کل کے مسائل کے سلسلے کی کڑی بھی ہے۔

باقی رہے نجات کا امکان کم سے کم!
رکھیے جناب شیخ پہ ایمان کم سے کم

شیخ شب بیدار تو دن میں بھی اب سوتا نہیں
نیند اڑا کر لے گئے اس کی گنہ گاروں کے خواب

منکر ہی رہا شیخ اُسے کاش خدا دے
وہ کرب جو احساس کی قندیل جلا دے

خالد نے اس کتاب کے پیش لفظ میں اپنے متعلق بڑی سچائی سے بتا دیا ہے۔ شاعری کے معیار کا فیصلہ آنیوالا وقت کرے گا۔ یہاں میرا مقصد خالد یوسف کے کلام کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا نہیں۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ خالد یوسف کے متعلق کوئی ابہام نہ رہ جائے۔ خالد یوسف بلاشبہ اس کاروانِ ادب میں شریک ہے جس کا سفر ۱۹۳۵ء میں لندن سے شروع ہوا تھا۔ اور ۱۹۳۶ء میں برصغیر سے۔ اگست ۱۹۸۵ء میں اس تحریک کا لندن ہی سے احیاء ہوا تو فکری اور نظریاتی سطح پر خالد یوسف میرے ساتھ قدم ملا کر چل رہا تھا۔ آج وہ اسی مشعل کو لے کر آگے بڑھ رہا ہے جو روشن خیال ترقی پسند اہلِ قلم نے جلائی تھی اور جس کا اُجالا آج مشرق و مغرب میں پھیل رہا ہے۔ زندگی کے مسائل سے خالد کا رشتہ اتنا ہی مضبوط ہے جتنا کہ کسی بھی ترقی پسند اہلِ قلم کا ہو سکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے

بڑے بڑے توانا اور قد آور اہلِ قلم پیدا کیے ہیں ، میری حقیر رائے میں خالدؔ یوسف بھی اسی اُفق پر اُبھرنے والا ایک روشن ستارہ ہے۔ وہ سستی شہرت کے لیے جتن کے بجائے شعور کی پختگی اور احساس کی شدت کے ساتھ مشقِ سخن میں مصروف ہے۔ پندرہ روزہ "جمہور" جو خالد کی زیرِ ادارت کئی سال سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔ اس کی وسعتِ نظر اور مقصد کی لگن کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اسے آج کے دور میں شہرت کے لیے پاپڑ بیلنے والوں کی قد و قامت کا پورا اندازہ ہے۔ لیکن وہ کسی صورتحال سے مایوس نہیں۔

قدم قدم پہ ہوئے بے وقار اہلِ سخن !!
جو مبتدی بھی نہ تھے ، ڈٹ کے ماہروں میں رہے
ہنوز خاک ہیں خالدؔ ، مگر ہمارے بعد
ہمارا نام بھی ممکن ہے شاعروں میں رہے

مجھے یقین ہے ان کے بعد نہیں بلکہ اُن کے سامنے ہی اُن کا نام معتبر شاعروں کی فہرست میں نمایاں جگہ حاصل کرے گا۔

سیّد عاشور کاظمی (لندن)
سکریٹری جنرل انجمن ترقی پسند مصنّفین برطانیہ

درودیوار کی بات

خالد یوسف

میرا پہلا شعری مجموعہ "حسرتِ گفتار" ۱۹۷۱ء کے افسوسناک ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ اگرچہ اس کتاب میں میرے طالب علمی کے دور کی تخلیقات غالب ہیں۔ مگر اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود آج بھی وہ میرا سرمایۂ حیات ہیں۔ کراچی سے عدم موجودگی کے باعث میں کتاب کی طباعت و اشاعت پر بھی مناسب گرفت نہ رکھ سکا۔ "حسرتِ گفتار" سے چند غزلیں اور قطعات اسی بنا پر "لبِ سحر" میں شامل کیے گئے ہیں۔

میں نے اُتر پردیش کے ایک ایسے زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی جس نے ہماری پشت تک پہنچتے پہنچتے نو آبادیاتی طاقت سے محاذ آرائی اور خود اپنی شاہ خرچیوں کی بدولت اپنی بیشتر مادی پونجی گنوا دی تھی۔ فرخ سیر کے عہد میں ہمارا خاندان افغانستان سے روہیلکھنڈ آکر آباد ہوا۔ ہمارے بزرگوں میں ایک حافظ رحمت خان شہید بھی تھے۔ دادا یوسف علی خان ایک زمانے تک تلہر (شاہجہانپور) میونسپلٹی کے چیئرمین رہے۔ میری پیدائش ان کی وفات کے بعد ہوئی۔ کہتے ہیں وہ انتہائی بارعب و پُروقار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے فیاض اور علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ آموں کی کاشت اور پرورش میں انہیں خصوصی دسترس حاصل تھی۔ میرے والد محمد احمد خان مائل تلہری ان کی واحد نرینہ اولاد تھے۔ وہ اگرچہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے۔ ایل ایل۔ بی تھے مگر بنیادی طور پر ان کا پیشہ موروثی زمینداری ہی رہا۔ وہ انتہائی درویش صفت انسان تھے اور زندگی بھر ان کی دلچسپیاں تاریخ، روحانیات، علمِ نجوم، رمل و جفر، شعر و ادب اور لسانیات سے رہیں۔ وہ سات زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ میں نے ان تمام میدانوں میں ان سے بہت کچھ سیکھا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو تحریکِ پاکستان اپنے شباب پر تھی۔ اس کے اثرات سب سے بڑے بھائی فیروز یوسف کے ذریعے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے، ہم تک بھی پہنچے۔ بھائی جان قائدِ اعظم کے ان معتمد طالب علم رہنماؤں میں شامل تھے جنہوں نے ۱۹۴۶ء کی انتخابی مہم کے دوران اپنا تعلیمی مستقبل پسِ پشت ڈال کر سندھ و پنجاب کے دورے کیے۔ ان طلبا نے اس طرح قیامِ پاکستان کی راہ ہموار کر کے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا تھا۔ افسوس کہ پاکستان نے اپنے محسنوں کی قدر نہ کی بلکہ ملک میں محسن کشی تو اب ایک روایت بن چکی ہے۔

تقسیمِ ہند کے ساتھ ہمارا خاندان بھی تقسیم ہو گیا۔ اور والدین ابھی ہجرت کے لیے تیار بھی نہ ہوئے تھے کہ ہم بھائی بہن جوش و خروش کے کندھے پر سوار پاکستان آ گئے۔ میری پرورش اور تعلیم بھائی جان ہی کے زیرِ سایہ ہوئی۔

میں نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول حیدرآباد (سندھ) اور پاک فضائیہ پبلک اسکول سرگودھا میں حاصل کی۔ جہاں سے امتیازی نمبروں سے ۱۹۵۶ء میں سینئر کیمرج پاس کیا۔ ان دو اداروں میں جن اساتذہ نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ ان میں ہمارے عربی کے استاد نسیم اللہ اور انگریزی کے مدرس گاڈفرے اسٹاٹ شامل ہیں۔ اس دوران ہم تھوڑی بہت شاعری بھی کرتے رہے جس کا چسکا سات سال کی عمر سے ہی پڑ گیا تھا۔ سرگودھا اسکول کا ماحول عسکری اور فرنگی تھا۔ دو تین کے سوا تمام اساتذہ انگریز تھے۔ اسکول میں جنرل غلام محمد ملک اور بنگلہ دیش کے جنرل منظور مرحوم اور جنرل مزمل میرے ہم جماعت تھے۔ مگر اسکول کا کورس دو سال جلد ختم کر لینے کی وجہ سے میں فضائیہ میں شامل نہ ہو سکا اور حیدرآباد واپس جا کر گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گیا۔

کالج میں میری ملاقات نسیم واسطی مرحوم سے ہوئی۔ بات بحث و تکرار سے شروع

ہوکر ایک لازوال دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے انقلابی افکار اور خلوص و ایثار نے میری سوچ کا دھارا ہی موڑ دیا۔ افسوس کہ عین جوانی ہی میں اس بے باک مردِ حق کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا۔ پروفیسر ناصر رضا خان کی شفقت و محبت اور ظفر اللہ قریشی اور کمانڈر ناصر احمد کی قابل اعتماد دوستی کا بھی میں تہہِ دل سے معترف ہوں۔ کالج میں داخلے کے اگلے برس ہی مجھے بھاری اکثریت سے طلبا یونین کا جنرل سکریٹری منتخب کر لیا گیا۔

طالب علم رہنما ہونے کے ناطے مجھے کئی سیاسی شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا جن میں سردار نشتر، حسین شہید سہروردی، خان عبدالقیوم خان اور میر رسول بخش تالپور شامل ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن سے وزیرِ اعظم سہروردی کے ہاں ملاقات ہوئی۔ بین الکلیاتی مباحثوں میں بار ہا اپنے کالج کی نمائندگی کی۔ معراج محمد خان، فتحیاب علی خان، احمد یوسف، معید حسن، نفیس صدیقی اور علی مختار رضوی سے اسی دور کی شناسائی ہے۔

حیدرآباد کی ادبی فضا پر ان دنوں قابل اجمیری مرحوم، حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی اور اختر انصاری اکبرآبادی چھائے ہوئے تھے۔ اختر انصاری مرحوم کے ادبی رسالے "نئی قدریں" میں میرا کلام بھی چھپا۔ طلبا کی سیاست سے جب بھی فرصت ملتی تو ایک جونیئر شاعر کی حیثیت سے میں بھی کبھی کبھار مشاعروں میں چلا جاتا تھا۔ سندھ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ۱۹۶۱ء میں ایم اے کرنے کے بعد میں نے وہیں دو سال پڑھایا۔ وہاں افتخار احمد خان ہمارے انتہائی مہربان استاد تھے۔

اسی دوران پروفیسر جمال نقوی، خالد وہاب، مشرف رضا جعفری (مدیر روزنامہ "بشارت") وغیرہ نے مل کر ادبی تنظیم "انجمن" کی بنیاد ڈالی۔ مجھے جنرل سکریٹری کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ہماری تنقیدی نشستیں "بشارت" کے دفتر میں ہوا کرتی تھیں۔ جس میں شہر

کے بیشتر ادیب اور اہلِ ذوق شریک ہوتے تھے۔ حبیب غوری نے اس کام میں ہمارا بڑا ہاتھ بٹایا۔ انجمن کے تحت ہم نے جسٹس رستم کیانی مرحوم کی یاد میں ایک عمدہ تقریب منعقد کی تھی، جس میں ڈاکٹر احسن فاروقی مرحوم، پروفیسر ممتاز حسین اور سید محمد تقی نے مقالے پڑھے تھے۔ صدارت کے لیے راجہ صاحب محمود آباد لندن سے تشریف لائے تھے۔ تقریب کے اختتام پر ان سے تحریکِ پاکستان کے بارے میں گفتگو کرنے کا اچھا خاصا موقعہ ملا۔ بعد میں جن سیاسی شخصیتوں کو میں نے قدرے قریب سے دیکھا ان میں محمد خان جونیجو، پیر الٰہی بخش مرحوم، ایئر مارشل اصغر خان، مولانا کوثر نیازی، جنرل چشتی، محمود الحق عثمانی، مشیر احمد پیش امام، عبدالباقی بلوچ، الٰہی بخش سومرو اور میاں ممتاز دولتانہ شامل ہیں۔ میر رسول بخش تالپور کی وساطت سے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی۔

۱۹۶۳ء میں اپنے احباب و اساتذہ کے اصرار پر اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھا اور پھر ہوا یوں کہ امتحان میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کر لینے کے باوجود مجھے انتظامی سروس سے محروم کر کے انکم ٹیکس کے حوالے کر دیا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اپنی غلامانہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ہماری مادر پدر آزاد سی۔ آئی۔ ڈی نے ڈنڈی مار دی تھی۔ مجھ سے نچلی پوزیشن رکھنے والے کئی احباب سرِ دست پاکستان کی مختلف ڈویژنوں میں کمشنر ہیں۔ "حسرت گفتار" میں شامل میری نظم "ایک ناانصافی پر" اسی واقعے کی جانب اشارہ ہے۔ سرکاری ملازمت کے دوران میں سکندر حیات خان قصوری کے مشفقانہ برتاؤ کا خاص طور پر ممنون ہوں۔

شاعری میں ابتدائی طور پر اقبالؔ، جوشؔ، مجازؔ، اخترؔ شیرانی، ساحرؔ لدھیانوی اور فیضؔ کے کلام نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔ مغربی شعرا اور ادیبوں میں شیلی، بائرن اور روسو نے میری فکر کو جلا بخشی۔ جوشؔ ملیح آبادی مرحوم، احمد فرازؔ اور فارغؔ بخاری نے

میری بیحد ہمت افزائی فرمائی۔ حیدرآباد میں ریڈیو پاکستان کے الیاس عشقی اور بنیش سلیمی مرحوم کے پرخلوص اصرار اور حوصلہ افزائی کے نتیجے میں "حسرتِ گفتار" وجود میں آئی۔

۱۹۷۱ء کے اواخر میں میرا تبادلہ میرپور خاص سے کراچی ہوگیا۔ اس کے بعد پے در پے کچھ ایسے سانحے رونما ہوئے کہ میری صحت گرتی ہی چلی گئی۔ پہلے ملک بنگلہ دیش کے عبرتناک المیے سے دوچار ہوا۔ پھر میرا عزیز ترین دوست نسیم واسطی داغ مفارقت دے گیا۔ اس کے بعد میری والدہ کا انتقال ہوا۔ عوامی حکومت کی لغزشوں نے بھی خوابوں کا شیش محل چکنا چور کرکے رکھ دیا۔ بالآخر صحت کی تلاش نے برطانیہ کی راہ دکھائی اور پھر ہم یہیں کے ہو رہے۔

میری شدید علالت کے دوران جن لوگوں نے میری خاطر شام و سحر ایک کردیئے ان میں بھائی سراج یوسف مرحوم، میری اہلیہ رشیدہ، بہن جاوید اور ڈاکٹر اولیور شامل ہیں۔ میرے عزیز کریم میمن اور ان کی اہلیہ بھی کوشاں رہے۔ احباب میں عبدالقادر بھنبھرو، عبدالرسول میمن اور شیر افضل خان نے خصوصی محبت کا مظاہرہ کیا۔ سراج یوسف دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک سی۔ ایس۔ پی افسر کی حیثیت سے وہ پاکستان میں کئی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ہم دونوں ہجرت نبویؐ کی تصویر کشی کرتے ہوئے اونٹ کی پشت پر سوار پاکستان میں داخل ہوئے تھے! افسوس کہ حد سے بڑھی ہوئی فرض شناسی اور خانگی صورتِ حال نے ان کو عجلت میں یہ دارِ فانی چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ جو لوگ انہیں قریب سے جانتے ہیں وہ آج بھی ان کے غم میں سوگوار ہیں۔

ادب اور سیاست کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر پر الگ سے روشنی ڈالنا فضول ہوگا کہ میرا کلام حاضر ہے۔ البتہ میرا ایمان ہے کہ موسیٰ ہوں کہ عیسیٰ، محمدؐ ہوں

کہ حسینؑ، سقراط ہوں کہ گوتم بدھ، مارکس ہوں کہ ٹراٹسکی، روزالکسمبرگ ہوں کہ چے گیویرا، ٹیپو سلطان ہوں کہ لممبا یا ماؤزے تنگ، سارے ایک ہی قافلۂ حق کے چراغ ہیں۔ جلد یا بدیر جبر و ستم اور باطل کی قوتوں کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑیں گے۔ بقول بائرن: "خون پانی کی طرح بہے گا مگر بالآخر فتح عوام کی ہوگی"۔

برطانیہ میں بحیثیت سفارت کار میں نے چھ سال گذارے۔ کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ پیشہ ورانہ سرگرمیوں سے جو وقت ملا وہ شاعری اور نجوم کی نذر ہوا۔

بقول مومن ؎ ــــــــــــ ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

یہ شوق ہمیں امریکہ اور سوئٹزرلینڈ سمیت بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں لے گیا۔ برطانوی اسٹرالاجیکل ایسوسی ایشن کے صدر چارلس ہاروے اور ان کی اہلیہ سوزی سے ملاقات ہوئی جو ایک مستقل دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ ۱۹۸۱ء میں مجھے پہلی اسٹرالاجیکل سوسائٹی کا سربراہ چن لیا گیا۔ تین سال تک یہ ذمہ داریاں نبھانے میں پیٹریشیا بیزلی، وینڈی بیزلی، پیٹریشیا فشر، حناتوہی، این اسمتھ، اسٹان ہرسٹ اور سلیم خان نے میری بیحد اعانت کی۔ مشتری سرکل کے تحت میں نے بہت سے لوگوں کو نجوم کی بنیادی تعلیم دی۔ رسیل گرانٹ سے بھی کچھ رفاقت رہی۔ برطانیہ میں جن احباب نے مجھے خصوصی طور پر لائق توجہ سمجھا، ان میں بیرسٹر انور حسین مرحوم، عقیل دانش، عاشور کاظمی، سلطان فاروقی، موج فرازی، جمیل مدنی مرحوم، ممتاز حیدر، عدیل صدیقی اور شیخ فضل اللہ حائری شامل ہیں۔ جن دوسرے دوستوں کا تعاون شاملِ حال رہا۔ ان میں امتیاز لودھی، عباس اور رضی بلگرامی، بلبل کاشمیری، اکبر حیدرآبادی، ڈاکٹر سلطان غوری، غیاث قریشی، صوفی رشید، محمد امجد فاروق عالم،

منظر نقوی۔ بلقیس چوہان اور فرزانہ ترنم کے اسمائے گرامی یقیناً قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے دوسرے احباب بھی ہیں۔ جنہوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ آخر میں میں اپنی اس ان دیکھی شاگردہ کا بھی ممنون ہوں جو "لبِ ترا" کی محرک بنی ہے۔

دیدارِ سحر بات مقدر کی ہے لیکن
ہم تیرگیٔ شب کو تو کم کرتے رہیں گے

خالد یوسف

دل گیسوئے جاناں سے بھی بیزار ہوا ہے
گلشن میں وہ جشنِ رسَن و دار ہوا ہے

پردے تو ہماری ہی نگاہوں پہ ہیں ورنہ
جو کچھ بھی ہوا ہے سرِ بازار ہوا ہے

اب شہر میں باقی کوئی مریم ہے نہ عیسیٰ
دل کس کی مسیحائی پہ بیمار ہوا ہے!

مہتاب کے غمزے بھی ہیں خورشید کے طالب
انکار کے پردے میں بھی اقرار ہوا ہے

اب محفلِ جاناں میں چلو لے کے خرد بھی
جو صرف جنوں لے کے گیا، خوار ہوا ہے

ہم نے نہ لیا عشق میں ہمراہ کسی کو !!!
ہر شخص تری راہ میں دیوار ہوا ہے

ہو جائے گا وہ بھی تو امر ہم کو جلا کر
شعلے کا مقدر ہے جو بیدار ہوا ہے

ہم فخرِ گلستاں ہی سہی یہ بھی تو دیکھو !!
جس پھول کو چاہا ہے، وہ تلوار ہوا ہے

ہر صبح رہِ عشق سے دل گذرا ہے خالد
ہر شام شہیدِ لب و رخسار ہوا ہے !!

خواہ معصوم چلے ، خواہ گنہگار چلے
آنکھ بھر آتی ہے جب کوئی سرِدار چلے

کوئی قاتل ہی ملے ، کوئی مسیحا نہ سہی !!!
کب تک امید کے صحراؤں میں بیمار چلے

بزمِ جاناں میں سبھی کچھ تھا مگر ظرف نہ تھا
ہم عبث لے کے تمناؤں کے انبار چلے

شیخ صاحب ہیں زمانے سے نرالے ورنہ !
سایۂ زلف نظر آئے تو دیوار چلے

دل کے فرہاد کو رسوا کریں درباروں میں
یہ اگر شرطِ محبت ہے تو ہم ہار چلے

کس کو ہم آبلہ پاؤں کا خیال آئے گا !!!
عین ممکن ہے کہ پھر بزم میں پیزار چلے

اپنی تقدیر میں ہے دشت نوردی خالدؔ
شہر میں جشنِ بہاراں ہو کہ تلوار چلے

قطعہ

یہ ظلمتیں، یہ فضا، یہ مہیب تنہائی
مگر ہمیں تو کسی بات کا ملال نہیں
سحر کو دیر لگے گی ضرور، کچھ تو ضرور
شبِ فراق ہے یارو، شبِ وصال نہیں

خواہ معصوم چلے ، خواہ گُنہگار چلے
آنکھ بھر آتی ہے جب کوئی سرِدار چلے

کوئی قاتل ہی ملے ، کوئی مسیحا نہ سہی !!!
کب تک امّید کے صحراؤں میں بیمار چلے

بزمِ جاناں میں سبھی کچھ تھا مگر ظرف نہ تھا
ہم عبث لے کے تمناؤں کے انبار چلے

شیخ صاحب ہیں زمانے سے نرالے ورنہ !
سایۂ زلف نظر آئے تو دیوار چلے

دل کے فرہاد کو رسوا کریں درباروں میں
یہ اگر شرطِ محبت ہے تو ہم ہار چلے

کس کو ہم آبلہ پاؤں کا خیال آئے گا !!!
عین ممکن ہے کہ پھر بزم میں بیزار چلے

اپنی تقدیر میں ہے دشت نوردی خالدؔ
شہر میں جشنِ بہاراں ہو کہ تلوار چلے

قطعہ

یہ ظلمتیں، یہ فضا، یہ مہیب تنہائی
مگر ہمیں تو کسی بات کا ملال نہیں
سحر کو دیر لگے گی ضرور، کچھ تو سرور
شبِ فراق ہے یارو، شبِ وصال نہیں

ملال اپنی نباہی کا کچھ زیادہ نہیں
ہنوز ترکِ وفا کا کوئی ارادہ نہیں

قبائے چاک بدن پر سجائے کیا پھرنا
لباس اہلِ وفا عشق ہے لبادہ نہیں

ہم اپنی آبلہ پائی پہ کیوں نہ ناز کریں
کہ اب ہمارے سوا کوئی پاپیادہ نہیں

ھزار آج وہ عالی نسب بنے لیکن!
جو ہم نہیں تو یہاں کوئی شاہزادہ نہیں

فراقِ گل میں خود اپنا چراغ گُل کرکے
کھُلا یہ راز کہ اب کوئی اتنا سادہ نہیں

نصیبِ چاک دلاں تھا کہ جام تک پہنچے !
یہ اور بات ہے اب بھی نصیب بادہ نہیں

سنائیں حالِ دلِ زار کیا اسے خالد !
وہ دلفریب سہی ، اس کا دل کشادہ نہیں

قطعہ

اہلِ دل ان کی جفاؤں کا گِلہ کرتے ہیں
اہلِ دل اپنی وفاؤں پہ پشیماں تو نہیں
آج بھی لب پہ وہی تذکرۂ عارض ولب
پابہ زنجیر سہی سربگریباں تو نہیں

الماس ہے پکھراج ہے کل دیکھئے کیا ہو
سر پر جو حسیں تاج ہے کل دیکھئے کیا ہو

درویش کی بات اور مگر عظمتِ شاہی،
تاریخ کی محتاج ہے کل دیکھئے کیا ہو

آغازِ سفر ہم نے کیا دار سے لیکن
یہ شیخ کی معراج ہے کل دیکھئے کیا ہو

جاگے نہ اگر جلد اجالوں کے پرستار
شہر آج بھی تاراج ہے کل دیکھئے کیا ہو

اب یار کی بستی بھی ہے اغیار کی بستی
دربان مہاراج ہے کل دیکھئے کیا ہو

مغموم سہی پھر بھی پر اُمید ہیں خالدؔ!
یہ دل کی فضا آج ہے کل دیکھئے کیا ہو

قطعہ

واعظ بنا، فقیہہ بنا، پارسا بنا
آئی جو شامِ وصل تو ہر بُت خدا بنا
بربادیوں پہ اپنی تعجب نہیں مگر
حیراں ہوں میرے شہرِ تمنا کا کیا بنا

بنے جو شمس و قمر ننگِ آسماں نکلے
جنہیں چراغ سمجھتے رہے دھواں نکلے

ذرا سی دیر میں ہر رند ہو گیا مومن
یقیں اسے بھی نہ تھا ہم بھی خوش گماں نکلے

نہ ہم میں جوہرِ غالب نہ ان میں شانِ ظفر
تو کس قصور میں کوئی قصیدہ خواں نکلے

کسی کی چاہ میں جب جاں بھی ہم گنوا آئے
تو لطفِ یار کے قصے کہاں کہاں نکلے

میں سوچتا ہوں کہ تاریخ کیا کہے گی ہمیں
سحر بدوش چلے ۔ شب کے پاسباں نکلے

ہدف ہمیں کو بناناکہ معتبر ٹھہرو
اس انجمن میں اگر ذکرِ دوستاں نکلے

جو سنگِ میل تھے بے آبرو ہوئے خالدؔ
جو گردِ پا بھی نہ تھے میرِ کارواں نکلے

قطعہ

فکرِ گل و لالہ ہے تو پھر خار ہی بن جاؤ
گلچیں کی ستائش سے کہیں بات بنی ہے
اس دامنِ رنگین کی طرف ہاتھ بڑھاؤ
زخموں کی نمائش سے کہیں بات بنی ہے

صحرائے سخن میں ہیں جو ہم ابرِ گہر بار
بے چین ہیں چڑھتے ہوئے سورج کے پرستار

اب نامۂ اعمال پہ موقوف نہیں کچھ
جو شیخ کی باتوں میں نہ آئے وہ گنہ گار

ہے شہرِ نگاراں کی ہر اک رسم نرالی
جو رات ہو سر دار وہی صبح سرِ دار

کیا کیجئے بے رحمئ اغیار کا شکوہ
گردش میں ستارے ہوں تو احباب بھی اغیار

صیاد کے پنجے میں اگر کوہ و دمن ہوں
جھرنوں کا ترنم بھی ہے زنجیر کی جھنکار

ہم چاک گریباں ہیں تو کیا شکر ہے خالد
باقی ہیں ابھی شہر میں تہذیب کے آثار

قطعہ

قدم قدم پہ جلاتے رہو چراغِ اُمید
کہ اس سفر میں ستاروں کا اعتبار نہیں
چلے چلو تو اُگ آئیں گے خونِ پا سے گلاب!
کہ اب چمن میں بہاروں کا اعتبار نہیں

باقی رہے نجات کا امکان کم سے کم
رکھیے جناب شیخ پہ ایمان کم سے کم

اس کا نہیں یہ تختِ سلیمان کم سے کم
اتنا تو جانتا ہے وہ نادان کم سے کم

وہ معتبر نہیں ہے مگر یہ تو دیکھیے !!!
لایا گیا ہے بیچ میں قرآن کم سے کم

بے سمت زندگی ہو تو بدتر ہے موت سے
مرتا نہیں ہے موت سے انسان کم سے کم

ہر ایک سرگنوائے ضروری نہیں مگر
ثابت رہے نہ کوئی گریبان کم سے کم

عہدِ خزاں دراز سہی مستقل نہیں
کرتے رہو بہار کے سامان کم سے کم

خالدؔ ہمارے شعر کی اوقات کیا، مگر
رہنے لگا ہے وہ بھی پریشان کم سے کم

قطعہ

کہہ دو تو زباں زباں پہ ہوگا !!
جو کچھ دلِ حق شناس میں ہو
شیطان سے دوستی نہ کرنا
شیطان کسی لباس میں ہو

ہجومِ رنگ کو ارژنگ ہم نہیں کہتے
غزل بھی صورتِ فرہنگ ہم نہیں کہتے

سخنوروں میں ہمارا شمار ہو کہ نہ ہو
فغاں کو نغمۂ و آہنگ ہم نہیں کہتے

وفا کی خلعتِ زیبا پہن کے نکلے ہیں
لباسِ شیخ کو خوش رنگ ہم نہیں کہتے

یہ اور بات ہے پتھر کو آئینہ سمجھیں
جو آئینہ ہو اُسے سنگ ہم نہیں کہتے

بہت بلند دُعا کا مقام ہے لیکن!
دوا کو بدعتِ افرنگ ہم نہیں کہتے

ھزار بار کیا اس نے قتل کا وعدہ
یہ شاعری ہے ، اسے جنگ ہم نہیں کہتے

اسی قصور میں بے ننگ و نام ہیں خالد
کہ ظلمتوں کو سحر رنگ ہم نہیں کہتے

قطعہ

سن کر وہ جس کا نام لرزتے ہیں شیر بھی
راہِ وفا میں آئے تو کچھ بھی نہیں ہے موت
پھر زندگی کی چاہ کریں کس کے واسطے
گر یار آزمائے تو کچھ بھی نہیں ہے موت

چارہ گر وہ بھی نہیں اور خوش گماں ہم بھی نہیں
جانتا ہے وہ کہ اسکے مدح خواں ہم بھی نہیں

ہم نہیں کہتے فلک پر کس طرح پہنچا مگر
وہ ستارہ ہے تو ننگِ آسماں ہم بھی نہیں

غیر کو گر آج شمشیر و سناں پر ناز ہے
بحث کے قائل نصیبِ دشمناں ہم بھی نہیں

فیصلہ تاریخ کا جو بھی ہو لیکن آج بھی
تم سخنور ہو تو محتاجِ بیاں ہم بھی نہیں

چاند کی صورت نظر آئے تو جاگیں اہلِ دل
بے ضرورت ظلمتوں کے پاسباں ہم بھی نہیں

آگ لگ سکتی ہے صرصر سے کہو ہولے چلے
سنگِ خارا ہیں مزارِ بے نشاں ہم بھی نہیں

ہو تو ہو اب شہرِ جاناں میں رقیبوں کا ہجوم!
آج خالدؔ یوسفِ بے کارواں ہم بھی نہیں

قطعہ

راہِ نجات یہ ہے کہ دولت کو بانٹ لو
محنت کے احترام میں محنت کو بانٹ لو
اتنے ستم ہوئے ہیں کچھ انصاف بھی تو ہو
دولت اگر نہیں ہے تو غربت کو بانٹ لو

قیس پابندِ گریباں ہے ذرا سوچو تو !
کیا یہی دشتِ غزالاں ہے ذرا سوچو تو !

شہر میں موسمِ خلعت ہے مگر یہ بھی ایک
شکلِ رسوائیٔ یاراں ہے ذرا سوچو تو !

معتبر نغمۂ بلبل ہے نہ اب خندۂ گل
صرف الزامِ بہاراں ہے ذرا سوچو تو !

ایک ہم ہیں کہ رکھے جاتے ہیں پردہ اس کا
شیخ بے باک ہے عریاں ہے ذرا سوچو تو !

وہ جو دن رات اجالوں کا بیاں کرتا ہے
ظلمتِ شب کا نگہباں ہے ذرا سوچو تو !!!

ہم کہ مجنوں تھے ہوئے شہر بدر لیکن اب
شہر کا شہر بیاباں ہے ذرا سوچو تو!

کربلائے دل و جاں ہے مگر اس سے آگے
اس کے ہونٹوں کا بدخشاں ہے ذرا سوچو تو!

باعثِ فخر ہے کوتاہ قدی بھی خالد
ساتھ وہ سروِ خراماں ہے ذرا سوچو تو!

قطعہ

وہ ایک لفظ جو لازم نہ تھا بیاں کے لیے
وہ چاند تھا جو کسی اور آسماں کے لیے
عجب ستم ہے کہ عنوان بن گیا آخر
جسے چنا تھا فقط زیبِ داستاں کے لیے

گلے کا ہار ہوئی شب کی تیرگی اب تو
وبالِ جان ہے یہ دل کی روشنی اب تو

طلوعِ صبح بہاراں کا خواب، خواب رہا
پھرے وہ دن کہ غنیمت ہے زندگی اب تو

گیا جو طور پہ وہ لوٹ کر نہیں آیا
قبولِ عام ہوا سحرِ سامری اب تو

سخن کے لعل و گہر بھی اسے منا نہ سکے
کہ مانگتا ہے صنم جان پیشگی اب تو

ہزار سال کی فرقت کے بعد آئے ہو
محبتوں کی فقط راکھ رہ گئی اب تو!

میں سوچتا ہوں وہ اس بار عُذر کیا دے گا
رہی نہ ایک کہانی بھی ان کہی اب تو

چراغ تھے جو ہوئے انجمن بدر خالدؔ
سفر ہے اور ہواؤں کی برہمی اب تو

قطعہ

ہر چمن دوست پہ ہوتی ہی رہی مشقِ ستم
لالۂ و گل سے مگر ہم نے کنارا نہ کیا
پھول زنجیر میں جکڑے ہوئے، کلیں آزاد
اپنی فطرت نے یہ ماحول گوارا نہ کیا

سُونے پڑے ہیں مِصر کے بازار کیا کریں
یوسف اگر نہ ہو تو خریدار کیا کریں

کب تک کریں گے صبحِ تمنّا کا انتظار
ٹھہری ہوئی ہے وقت کی رفتار کیا کریں

یہ جان جو انہیں کی امانت ہے دوستو
مانگیں وہ مسکرا کے تو انکار کیا کریں

چاہت میں کوئی ہم سے زیادہ نہیں مگر
ہم خود نگاہِ یار ہیں دیدار کیا کریں

اب چپ رہے تو عرضِ تمنا کریں گے کب
موسم کی بات ان سے سرِدار کیا کریں

دستِ یزید میں ہو اگر پرچم حسینؑ !
کوئی ہمیں بتاؤ وفادار کیا کریں

اب انجمن میں کون نہیں صاحبِ نظر
خالدؔ ہم اپنی رائے کا اظہار کیا کریں

قطعہ

وہ شاخ پر ہو نمایاں کہ دستِ گلچیں میں
وہ میرے پاس نہیں ہے تو کیا گلاب تو ہے
یہ دوریاں تو ضمانت ہیں جذبِ پیہم کی !
زمیں سے دور سہی کوئی ماہتاب تو ہے

پھر سر سے کہیں شیخ کے دستار نہ گر جائے
ان تند ہواؤں میں یہ مینار نہ گر جائے

تم سایۂ یاراں سے گریزاں تو ہو لیکن !!
تکیہ ہے تمہیں جس پہ ، وہ دیوار نہ گر جائے

رسوا ہیں خریدار مگر اسکی بلا سے !
تشویش فقط یہ ہے کہ بازار نہ گر جائے

میں تجھ کو بھلانے کو بھلا سکتا ہوں لیکن
ڈرتا ہوں مرے شعر کا معیار نہ گر جائے

کرنا ہے اگر قتل ذرا پیار سے کیجے !
غصّے میں کہیں ہاتھ سے تلوار نہ گر جائے

دو چار قدم اور درِ یار ہے خالدؔ!
اب راہ میں تھک کر دلِ بیمار نہ گر جائے

قطعہ

تیرگی اور بڑھے اور بڑھے اور بڑھے
آندھیاں اور چلیں اور چلیں اور چلیں
شمعِ اُمید کسی طور نہ بُجھنے دینا
بزم میں مے نہ سہی خون کے ہی دور چلیں

بُجھنے لگے چراغ سرِ شام کچھ تو ہو !!!
ظلمت ہے اور اپنے در و بام کچھ تو ہو !

آیا نہ کوئی ساعتِ وعدہ تو کیا ہوا
باقی ہے رات اے دلِ ناکام کچھ تو ہو !!

ایسا نہ ہو کہ لوگ سمجھنے لگیں شہید
ہم ہیں ستونِ دار ہے الزام کچھ تو ہو

ہم بھی کہیں گے ظلمتِ شب کو خدا کی دین
لیکن وہ گلبدن وہ پری رام کچھ تو ہو !!

کچھ سوچ کر ہی میں نے چُنے ہیں صلیب و دار
اس دشمنِ قرار کو آرام کچھ تو ہو !

یا کوچۂ حبیب سے ملے یا فنا کی چھاؤں
اس کاروانِ شوق کا انجام کچھ تو ہو

زلفوں کی چھاؤں ، ہونٹ کی سُرخی ، بدن کی دھوپ
خالد ہمارے شعر کا انعام کچھ تو ہو

قطعہ

پہنچ گئے ہیں قدم چاند پر بھی یاروں کے
میں سوچتا ہوں تجھے چاند سا کہوں نہ کہوں
لگے ہوئے ہیں ستاروں کی تاک میں کچھ لوگ
میں کہکشاں کو تری گردِ پا کہوں نہ کہوں !!

حسبِ معمول وہ جھوٹا ہو ، بہت ممکن ہے
دیر کے روپ میں کعبہ ہو ، بہت ممکن ہے

ہم نے ظلمت کو بھی سینے سے لگائے رکھا
اب سحر صورتِ لیلیٰ ہو ، بہت ممکن ہے

ایسے برحق بھی نہیں سنگزنی کے احکام
شیخ کل خود ہی تماشا ہو ، بہت ممکن ہے

بزم میں ایک حسیں کو بھی نہ آنے دینا
پھر ہمیں یار کا دھوکا ہو بہت ممکن ہے

تم جسے پاؤں تلے روند رہے ہو یارو
وہ مقدّر کا ستارا ہو ، بہت ممکن ہے

ہم کو ہر طرح سے برباد کیا ہے جس نے
خود بھی بربادِ تمنّا ہو ، بہت ممکن ہے

جب بھی ملتا ہے وہ بے مہر تو ہم سوچتے ہیں
آج وہ آگ کا دریا ہو ، بہت ممکن ہے

حسرت و یاس کے صحراؤں سے آگے یارو
گلستانِ تر و تازہ ہو ، بہت ممکن ہے

تم مجھے شعر سُنانے پہ نہ مجبور کرو !
رَسَن و دار کا قصّہ ہو ، بہت ممکن ہے

پیاس جنّت میں بھی مشکل سے بُجھے گی خالدؔ
لب و رخسار کا صحرا ہو ، بہت ممکن ہے

سحر کی آس لیئے شب کے دائروں میں رہے
کس اعتماد سے زندہ مجاوروں میں رہے

اگرچہ شرط نہیں بال و پر گنوانے کی !
قفس پسند رہے جو بھی طائروں میں رہے

تمام عمر کی رعنائیاں سمیٹ کے شیخ
یہ سوچتا ہے کہ اب کون کافروں میں رہے

کسی نے ہم کو جو پتھر سمجھ کے پھینک دیا
تو سنگِ میل بنے ہم مسافروں میں رہے

وفا کی راہ میں کیا کیا نہ مرحلے دیکھے
غبار بھی جو نہیں تھے وہ خاطروں میں رہے

کسی کے عہد کو پہنچے جو آزمانے ہم !!!
وہ بھیڑ تھی کہ چھٹی بھی تو زائروں میں رہے

قدم قدم پہ ہوئے بے وقار اہلِ سخن !
جو مبتدی بھی نہ تھے ڈکٹ کے ماہروں میں رہے

ہنوز خاک ہیں خالد ہمارے بعد مگر
ہمارا نام بھی ممکن ہے شاعروں میں رہے

قطعہ

صرصر کے تھپیڑوں کو صبا کون کہے گا
اشکِ گل و لالہ کو روا کون کہے گا
یہ وہم کی اک رات بھی چھٹ جائے گی آخر
اب جھوٹے خداؤں کو خدا کون کہے گا

ناحق سپردِ دار ہوئے اور کیا کہیں
حالات کا شکار ہوئے اور کیا کہیں

اس چشمِ پارسا میں کھٹکتے ہیں صرف ہم
سب خار وخس بہار ہوئے اور کیا کہیں

گلچیں کی کیا مجال جو پھولوں کو چھیڑتا
گل خود شریکِ کار ہوئے اور کیا کہیں

ہر صبح احتساب کو نکلے جنابِ شیخ!
ہر شام میگسار ہوئے اور کیا کہیں

وہ پھول جو چُنے تھے مزاروں کے واسطے
ظالم گلے کا ہار ہوئے اور کیا کہیں

مقصد ہو انتقام تو ہم لیں کسی کا نام
آئینے سنگبار ہوئے اور کیا کہیں

اس آس میں کہ وہ بھی پشیماں ہو ایکبار
ہم قتل بار بار ہوئے اور کیا کہیں

شہرِ جنوں ہے راہِ ترقّی پہ گامزن !!!
پیدل بھی شہسوار ہوئے اور کیا کہیں

خالدؔ نہ غازیوں نہ شہیدوں میں نام ہے
ہم جنگ سے فرار ہوئے اور کیا کہیں

گھر اس کے اجالوں سے منوّر نہیں ہوتا
ہر شخص تو قسمت کا سکندر نہیں ہوتا

تشریح طلب ہیں قد و قامت کے فسانے
برگد شجرِ گل کے برابر نہیں ہوتا

اب رنگِ رخِ شیخ پہ بےکار تعجّب
کس دل میں تمنّاؤں کا لشکر نہیں ہوتا

سو بار ہوئے قتل مروّت کی خطا میں
احباب سے شکوہ بھی مکرّر نہیں ہوتا

جس دشت میں پہنچے گل و گلزار کھلائے
آوارہ بہاروں کا کوئی گھر نہیں ہوتا

جوہر ہو تو ہر حال میں دیتا ہے شعاعیں !!
ماحول کا محتاج سخنور نہیں ہوتا!

کیا فتح کی اُمید رکھیں عشق میں خالدؔ
یہ معرکۂ دل تو کبھی سر نہیں ہوتا!!!

قطعہ

جو پھول کھلا وہ شعلۂ غم، ہر لطف کی تہہ میں جبر و ستم
کس آس میں بیٹھے ہو یارو، کیا آس سے شمعیں جلتی ہیں
مانا کہ ہماری بستی کے پتھّر بھی دمکتے ہیرے ہیں
احساس نہیں تو کچھ بھی نہیں، احساس سے شمعیں جلتی ہیں

نصیحتوں کے یہ دفتر ہمیں قبول نہیں
تم اپنی فکر کرو تم خدا رسُول نہیں

ہماری آبلہ پائی کا درد اور اُسے !!!
چمن کو سرو و سمن چاہیے ببول نہیں

جنابِ شیخ کا ہر عُذر مستند لیکن
ہنوز باغِ تمنا میں ایک پھُول نہیں

انھُیں کی جیب میں سورج اُنھیں کی گود میں چاند
وہ خوش نصیب ہیں جن کا کوئی اصول نہیں

خبر تو ہوگی اسے دیر سے سہی خالدؔ
کہ ہم وفا کا ہمالہ ہیں خاک دُھول نہیں

دیکھو تو ہر اک شے پہ بہاروں کی پھبن ہے
سوچو تو وہی سلسلۂ دار و رسن ہے

اس دشت میں کانٹوں سے بھی محروم ہیں ہم آج
یہ دشت جو ہم آبلہ پاؤں سے ختن ہے

اب پھول کو حاصل ہے نہ بلبل کو میسّر!
صیّاد کے چہرے پہ جو بےساختہ پن ہے

اب کس کو سرور آئے گا کلیوں کی چٹک پر
سنتے ہیں کہ گلچیں بھی شہنشاہِ سخن ہے

ہم چاک گریبانوں کو ہنس ہنس کے نہ دیکھو
اس بزم میں خلعت بھی عطا ہو تو کفن ہے

صنم کے دل میں محبّت کا کوئی خانہ نہ تھا
تمام تیر چلائے مگر نشانہ نہ تھا

کسی کی نذر سوائے خلوص کیا کرتے
ہمارے پاس تو لفظوں کا بھی خزانہ نہ تھا

تمام رات جلے جو چراغ کی صورت
سحر ہوئی تو اُنہیں کا کہیں ٹھکانہ نہ تھا

ہمارے دم سے ہُوا شہر شہرِ نغمۂ و ساز
مگر ہمارے لیے ایک بھی ترانہ نہ تھا

ہم اس خطا میں سپردِ صلیب و دار ہوئے
تمام شہر سے تنہا، اس سے دوستانہ نہ تھا

ہوا کے رُخ کا کسی کو ہُوا نہ اندازہ !!
اُڑے تو لاکھ قفس ایک آشیانہ نہ تھا

دو نیم ہو کے بھی بدلا نہ ماہتاب کا رنگ !
شکست کھائی مگر یہ بھی تازیانہ نہ تھا

انہیں بھی حُسن نے گمراہ کر دیا آخر !
مزاج جن کا لڑکپن سے عاشقانہ نہ تھا

دیارِ یار کے چُھٹنے کا غم تو ہے خالد
ہزار بار کہیں ہم کہ آب و دانہ نہ تھا

اگرچہ جتنے ستارے ہیں شب گزیدہ ہیں،
سحر بھی دُور نہیں ہم جو آبدیدہ ہیں

ہوئیں رقیب سے باتیں تو یوں ہوا محسوس
ستمگروں میں بھی اکثر ستم رسیدہ ہیں

شماریات وہ نازک خیال کیا جانے
یہی بہت ہے کہ دوچار سَر خمیدہ ہیں

جنابِ شیخ کے چہرے کا نُور ہیں ہم لوگ
تعلقات ہمیں سے مگر کشیدہ ہیں !!

خدا تو عین محبت ہے، دلنوازی ہے
حضور آپ ہی مُنکر ہیں، بےعقیدہ ہیں

غزل کہی تو گرے حسن کی نگاہوں میں
وہ معتبر ہیں جو اب صاحبِ قصیدہ ہیں

سیاہِ شب نے پہن لی ہیں خلعتیں جب سے
گناہگار ہیں جو پیرہن دریدہ ہیں !!

یہ بے حسی کی فضا مستقل نہیں خالدؔ
ہنوز شہر میں کچھ لوگ ناشنیدہ ہیں

قطعہ

ہوتی ہے وہ اب لالۂ و گل کے آگے
کانٹوں پہ بھی جو بات گراں گذری ہے
خورشید نے بخشی ہے بطورِ انعام !
خوابوں پہ بھی جو رات گراں گذری ہے

سفر نصیب غبارِ دلِ زمانہ ہوئے
اُڑے جو شاخ سے پنچھی تو شاخسانہ ہوئے

گلی گلی سے قیامت کی بات کرتے ہیں
جنابِ شیخ کو حسرت رہی خدا نہ ہوئے

تمام شہر اگرچہ رقیب تھا لیکن!
تری گلی میں تو حملے بھی قاتلانہ ہوئے

دراز دستئ اربابِ حُسن تو دیکھو!
رقیب ہاتھ نہ آئے تو ہم نشانہ ہوئے

انہُیں کے دم سے چمن کا وقار قائم ہے
کئی گلاب جو منت کشِ صبا نہ ہوئے

جنابِ شیخ کی اوقات کیا کہ ریت کے ڈھیر
چلی ہوا تو کہانی ہوئے فسانہ ہوئے

ہر ایک موڑ مزارِ وفا بنا خالدؔ
مجاہدانہ چلے تھے مجاورانہ ہوئے

قطعہ

پتھر کے خدا ٹوٹ کے گر جائیں گے آخر
خوابوں کے تراشیدہ صنم زندہ رہیں گے
ہر دور میں ہو جاتے ہیں کچھ زینتِ بازار
ہر دور میں کچھ اہلِ قلم زندہ رہیں گے

مُنکر ہی رہا شیخ اسے کاش خُدا دے
وہ کرب جو احساس کی قندیل جلا دے

ساحل سے تو سو بار کیا اس نے کنارا
اب یہ نہ کہیں ہو کہ سفینہ بھی گنوا دے

سو بار پھرے وصل کے وعدوں سے جو گلفام
وہ نیک سہی ، نیک نہیں اس کے ارادے

کیوں باغِ تمنّا میں ہر اک مہر بلب ہے
اس چُپ کا ثمر موت ہے کوئی تو صدا دے

ہے اور کوئی ڈر تو الگ بات ہے لیکن
گر خوفِ خدا ہے تو اتارو یہ لبادے

گر جرأتِ پرواز نہیں ، شور مچاؤ !!
وہ شور کہ صیّاد کے بھی ہوش اُڑا دے

ہرچند کہ یہ رات قیامت کی ہے خالد
ممکن ہے یہی صبحِ بہاراں کا پتا دے

قطعہ

اجل حیات پہ خنداں ہے اُن سے کہہ دینا
خزاں کی زد میں گلستاں ہے اُن سے کہہ دینا
اب ایک گل کی پرستش کے ہم نہیں قائل!
اب انتظارِ بہاراں ہے ۔ اُن سے کہہ دینا

وفا کی راہ میں کوئی تو بے وفا ہو گا
وہ ہم نہیں تھے ، بہت جلد فیصلہ ہو گا

بہار اپنا مقدّر سہی مگر پہلے
روش روش پہ خزاں سے مقابلہ ہوگا

تمام شہر ہم اہلِ جنوں پہ بند نہیں
درِ قفس ہی سہی ایک در کھُلا ہوگا

جنابِ شیخ کے ہوتے سحر نہیں ممکن
ملی جو اُن سے فراغت تو کچھ بھلا ہو گا

فقط ثواب کی خاطر نہیں یہ سنگزنی
ہمیں چھوئے گا تو پتھر بھی دیوتا ہوگا

بڑے سکوں سے وہ سویا ہے قتل کرکے ہمیں
کھلے گی آنکھ تو موسم بدل چکا ہوگا !!

وہ ایک گُل ہے مگر سب سے مختلف خالدؔ
صبا نے اس سے اکیلے میں کچھ کہا ہوگا

قطعہ

اگرچہ ان کی جفا کو کبھی جفا نہ کہا
انہوں نے جو بھی سزا دی اُسے سزا نہ کہا
یہ سب بجا ہے مگر اتنا ظرف رکھتے ہیں
بتوں کو ہم نے سرِ دار بھی خدا نہ کہا

ہم نہ کہیں تو شعر کیا، تم نہ سُنو تو بات کیا
دونوں چراغِ انجمن، ترکِ تعلقات کیا

دل کو لہو سے کیا گریز، گُل کو صبا سے کیا حجاب
شرم و حیا بجا مگر ہم سے تکلّفات کیا

بزم کی آبرو بھی ہم اور لہُو لہُو بھی ہم
ہم کو مٹا دیا مگر آیا کسی کے ہات کیا

رختِ سفر تو کھو دیا، رختِ سحر بچا رکھو
اُگتی رہے گی فصلِ غم، ٹھیری رہے گی رات کیا

زرد ہے دل کا ماہتاب اور خموش سطحِ آب
وقت کی آستیں میں پھر ہے کوئی واردات کیا

مشکِ ختن بھی زلفِ یار دار و رسن بھی زلفِ یار !
اُلجھے رہیں گے عمر بھر دل کے معاملات کیا

شعر و سخن کے رُوپ میں ہم تو سدا بہار ہیں
عمر ڈھلی تو کچھ نہیں، حُسن کی کائنات کیا

گرچہ قدم قدم پہ ہیں مصلحتوں کے سنگِ میل
ہم ہیں پیمبرِ بہار، کھائیں خزاں سے مات کیا

قطعہ

وہ نہیں آئے تو کیا صبح تو آئے گی ضرور
ہم سے خورشید نے پیمان وفا باندھا ہے
زلف و مژگان بھی اندھیروں کے طرفدار سہی
دل سے اُمّید نے پیمانِ وفا باندھا ہے

وفا کے تاج محل دوش پر اٹھائے ہوئے
ہم ایک شاہجہاں ہیں مگر بھلائے ہوئے

هزار بخششِ فصلِ بہار تو دیکھو !!!
کسی کی جان تھے ہم لیکن اب پرائے ہوئے

عطا ہوئی ہے وہ توقیر روسیاہوں کو
ہم اپنے شہر میں پھرتے ہیں منھ چھپائے ہوئے

هر ایک بات پہ کیا سامری کو دیں الزام
ہمیں کلیم، ہمیں ہیں فریب کھائے ہوئے

وہ لوگ اس کی وفا کا یقین کیا کرتے
جنہیں خبر ہے کہ قاصد بھی ہیں پڑھائے ہوئے

ہمیں اٹھا کے تمہیں لائے بزم تک اے دوست
درِ رقیب پہ بیٹھے تھے سر جھکائے ہوئے

جگر فگار سہی ، جانِ مستعار سہی !!!
ہم آج بھی ہیں بہاروں سے لَو لگائے ہوئے

خدا کا شُکر ہے اس دور میں بھی ہم خالدؔ
فصیلِ حق پہ کھڑے ہیں قدم جمائے ہوئے

قطعہ

رشتۂ درد نبھاتے ہوئے کچھ دُور ضرور
ہر بھٹکتے ہوئے راہی کی رفاقت کی ہے
کسی پروین کی طلب ہے نہ ثریا کی تلاش
ہم نے بھرپور محبت سے محبّت کی ہے

دیکھئے اس کو تو ہر بات گلِ تر کی طرح
بات کیجے تو وہی شخص ہے پتّھر کی طرح

عقل حیراں ہے کن الفاظ میں تعریف کروں
حُسن اور وہ بھی چھلکتے ہوئے ساغر کی طرح

برق گفتار سہی ، شعلۂ و تلوار سہی !
ہم مگر ظرف بھی رکھتے ہیں سمندر کی طرح

آزماؤ گے تو ہم جاں سے گذر جائیں گے
کاغذی شیر نہیں ہیں کسی افسر کی طرح

دل کو بہلاتے ہیں افسانۂ آزادی سے
ہم نے اک طوق پہن رکھا ہے زیور کی طرح

راج کرتے ہیں وہی لوگ دلوں پر خالدؔ
بخش دیتے ہیں جو دشمن کو سکندر کی طرح

قطعہ

ہر لفظ کو عنواں کہیں ، یہ تو نہ ہوگا
اب وہم کو ایمان کہیں ، یہ تو نہ ہوگا
ممکن ہے نہ ہو جراٴتِ فریاد بھی لیکن
بیداد کو احسان کہیں یہ تو نہ ہوگا

نظر نظر فریب ہے، بدن بدن فریب ہے
جسے بھی چھو کے دیکھئے، وہ موم تن فریب ہے

ہمیں بھی بزمِ خاص میں بلا رہے ہیں وہ مگر
خلوص کے بغیر ہو تو انجمن فریب ہے

نظر تو کہہ رہی ہے اس کی سادگی پہ مر مٹو
مگر بضد ہے تجربہ کہ بھولپن فریب ہے

چمن کو انتظارِ فصلِ دل ہے ایک عمر سے
نہ فصلِ گل پہ جا کہ وہ بھی جانِ من فریب ہے

کسی کا دل لبھائیے ، کسی کو گدگدائیے !!!
اگر حیات سے الگ رہے تو فن فریب ہے

قطعہ

کوئی چہرہ نہ بنے تیرے تصوّر کا رقیب
کوئی جنّت ترے رخسار سے آگے نہ بڑھے
دلِ برباد کو پرواہ ہے تو صرف اتنی ہے
کوئی بھی غم ہو ، غمِ یار سے آگے نہ بڑھے

چراغ ضبطِ تمنا سے جل نہ جائیں کہیں
گلوں کے اشک ستاروں میں ڈھل نہ جائیں کہیں

اسی لیے ہیں گراں پا کہ ہم جو تیز چلے !!
دیارِ یار سے آگے نکل نہ جائیں کہیں

بچھا رہے ہیں مری راہ میں جو انگارے
وہ ہاتھ پھول ہیں ڈرتا ہوں جل نہ جائیں کہیں

قدم قدم پہ بچھاؤ بساطِ کیف و نشاط
شراب اور پلاؤ ، سنبھل نہ جائیں کہیں

ہر ایک گام پہ اشکوں کے گرم چشمے ہیں
دلوں کے سنگ سنبھالو ، پگھل نہ جائیں کہیں

چلے چلو کہ بھروسہ نہیں ہواؤں کا !!!
ابھی ہیں ساتھ، ابھی رخ بدل نہ جائیں کہیں

درِ حبیب ہو یا کوچۂ عدو خالد
یہ آرزو ہے کہ اب سر کے بل نہ جائیں کہیں

قطعہ

دل قلندر ہو تو انسان ستاروں سے بلند
افسری، جاہ و حشم ، دولت و شہرت کیا ہے
سر وہی ہے جو کسی تاج کا محتاج نہ ہو
زلفِ جاناں نظر آئے تو حکومت کیا ہے

چراغ ضبطِ تمنا سے جل نہ جائیں کہیں
گلوں کے اشک ستاروں میں ڈھل نہ جائیں کہیں

اسی لیے ہیں گراں پا کہ ہم جو تیز چلے !!
دیارِ یار سے آگے نکل نہ جائیں کہیں

بچھا رہے ہیں مری راہ میں جو انگارے
وہ ہاتھ پھول ہیں ڈرتا ہوں جل نہ جائیں کہیں

قدم قدم پہ بچھاؤ بساطِ کیف و نشاط
شراب اور پلاؤ، سنبھل نہ جائیں کہیں

ہر ایک گام پہ اشکوں کے گرم چشمے ہیں
دلوں کے سنگ سنبھالو، پگھل نہ جائیں کہیں

چلے چلو کہ بھروسہ نہیں ہواؤں کا !!!
ابھی ہیں ساتھ، ابھی رخ بدل نہ جائیں کہیں

درِ حبیب ہو یا کوچۂ عدو خالدؔ
یہ آرزو ہے کہ اب سر کے بل نہ جائیں کہیں

قطعہ

دلِ قلندر ہو تو انسان ستاروں سے بلند
افسری، جاہ و حشم، دولت و شہرت کیا ہے
سر وہی ہے جو کسی تاج کا محتاج نہ ہو
زلفِ جاناں نظر آئے تو حکومت کیا ہے

اِدھر بھی جفائیں ، اُدھر بھی جفائیں
کسے اپنے خوابوں کا مرکز بنائیں

سرِ شہر حیراں ہیں، کس سمت جائیں
ھر اِک موڑ پر خوبصورت بلائیں

وہ سر آسمانوں سے ہو جس کو نسبت
وہ سر آستانوں پہ کیا ہم جُھکائیں

نہ جانے سفینے پہ کیا بیت جائے
اُفق سے پرے اُٹھ رہی ہیں گھٹائیں

جفا کا بھی ان کو سلیقہ نہیں تھا
مگر کام آئیں ہماری وفائیں

ہمارے ہی اشکوں سے طغیانیاں ہیں
سُنا کر غزل اب تمہیں کیوں رُلائیں

کوئی مہ جبیں مہرباں ہو تو خالد
ستارے بھی ہم عرش سے توڑ لائیں

قطعہ

احباب کی قلت بھی گوارا ہے مگر ہم
دُکّی سے جو کٹ جائیں۔ وہ اِکّے نہیں رکھتے
معیارِ وفا آج بھی غربت نہ امارت
کھوٹے ہوں تو ہم جیب میں سکّے نہیں رکھتے

وہ روٹھ جائیں تو خوابوں میں بھی وصال نہیں
وہ مہرباں ہوں تو جنت کا بھی سوال نہیں

انہی کے حسن سے شمعِ خیال روشن ہے
یہ اور بات ہے ان کو مرا خیال نہیں

تمہارے لب پہ کبھی طعنے، ملال ہے اس کا
تمہاری راہ میں لُٹنے کا تو ملال نہیں

بایں ہجومِ بہاراں تلاش ہے اس کی
وہ اک بہار جو پابندِ ماہ و سال نہیں

جمال وہ ہے جو روشن کرے وفا کے چراغ
جو صرف آگ لگا جائے وہ جمال نہیں

میں تجھ کو گُل کہوں، نغمہ کہوں کہ چاند کہوں
میں کیا کہوں کہ کوئی بھی تری مثال نہیں

وہ جس کی چاہ میں ہم بخش آئے گنگ و جمن
یہ کیا ہوا کہ ترے رُخ پہ بھی وہ خال نہیں

وہ آج لاکھ سرافراز ہوں مگر خالد
انہیں ثبات نہیں ہے، ہمیں زوال نہیں

قطعہ

احبابِ سُبک گام پہ تنقید نہ کیجیے!!
ہرگز گلۂ زہرہ و ناہید نہ کیجیے
اک پھول بھی دے کوئی تو احسان ہے اس کا
وابستہ کسی سے کوئی اُمید نہ کیجیے!!!

مشتاق ہے دل کوئی تماشا نظر آئے
وہ بلبل بیزار، وہ غنقا نظر آئے

وہ گھور اندھیرا ہے کہ دل ڈوب رہا ہے
سورج نہ سہی کوئی ستارا نظر آئے

گر دل کی نہ سنتے تو سبھی کچھ تھا وطن میں،
بن باس لیا ہے کہ وہ سیتا نظر آئے

فرقت میں یہی وقت جو کاٹے نہیں کٹتا
ہو اُن سے ملاقات تو اُڑتا نظر آئے

وہ یورشِ گلچیں ہے کہ اب صحنِ چمن میں
ہر پھول کو لازم ہے کہ شعلہ نظر آئے

یہ سوچ کے گلشن سے چلے آئے ہیں خالدؔ
ممکن ہے کوئی پھول سا چہرہ نظر آئے

قطعہ

کسی کو زہر کا پیالہ، کسی کو آبِ حیات
یہ کائنات یہ دنیا عجیب بستی ہے!!
کسی کی بزم منوّر ہے تیری آنکھوں سے
کسی کی آنکھ تری دید کو ترستی ہے!!

شیخ بھی ہے آج کچھ بہکا ہوا
خلوتوں میں کون جانے کیا ہوا !!

درد کی شب ہو گئی اتنی طویل !
ماہ و انجم کا بھی دل پھیکا ہوا

سایۂ دیوار بھی آسیب تھا
جب تھکن اُتری تو اندازہ ہوا

اب فضا میں کوئی نغمہ ہے نہ گیت
اور دل کا ساز بھی ٹوٹا ہوا !!!

آج بھی دشتِ جنوں ہے اور ہم
شہر تو سارا سگِ لیلیٰ ہوا !!!

کیا کوئی خورشید رُخ آنے کو ہے
چاند ہے پھر سوچ میں ڈوبا ہوا

منتظر کوئی سرِ منزل نہ تھا
راستہ بھولے، چلو اچھا ہوا

مشعلِ دل کو فروزاں کر لیا!!
رات ہے اور کارواں بھٹکا ہوا

خالدؔ اپنا کُل اثاثہ ایک دل
وہ بھی زلفِ یار میں اُلجھا ہوا

رقیبوں میں خطبوں خطابوں کی باتیں
ستاروں میں ہیں ، انقلابوں کی باتیں

اُن آنکھوں میں ہیں پھر شرابوں کی باتیں
کہاں تک کریں ہم حسابوں کی باتیں

مرا نام اور اُس ستم گر کے لب پہ
کیے جائیے آج خوابوں کی باتیں

بھنور میں سفینہ ہے کرتے ہیں لیکن
سمندر سے وہ ماہتابوں کی باتیں!

غنیمت ہے خیراتِ وعدہ بھی یارو
فقیری میں کیا انتخابوں کی باتیں

اگر چاند ہو تم سرِ بام آؤ !!!
بہت ہو چکیں اب نقابوں کی باتیں

کسی نیک صیّاد کی بات کیجے !!
چمن میں نہ کیجے، گلابوں کی باتیں

اگر داد چاہیں تو کس منھ سے خالدؔ
ممولوں کے آگے عقابوں کی باتیں

قطعہ

یہ بام و در نظر آتے ہیں تیرے عارض و لب
شجر شجر میں ترے جسم کی شباہت ہے
قدم قدم پہ جفاؤں کے سلسلے ہیں مگر
ترے وجود سے یہ شہر خوبصورت ہے

دلِ یار پارہ سنگ ہے، ہمیں آج تک یہ خبر نہیں
کہ وفا میں جاں سے گذر گئے مگر اس پہ کوئی اثر نہیں

ترے روبرو بھی ہیں معتبر وہی بے خلوص ستائشیں
وہی حسنِ گل کی نمائشیں، ابھی زخمِ گل پہ نظر نہیں

کوئی غم میں سینہ فگار ہو کہ چراغِ تختۂ دار ہو
کوئی لاکھ اس پہ نثار ہو اسے اعتبار مگر نہیں

کوئی کیسے ان کو خفا کرے، کوئی کیسے ترکِ وفا کرے
کبھی پھول ہے کبھی چاند ہے، رخِ یار سے تو مفر نہیں

یہ حسین پیکرِ مرمریں، یہ دراز گیسوئے عنبریں
رہیں مہرباں جو یہ جنتیں تو ہمیں بھی شوقِ سفر نہیں

مجھے گام گام بہشت ہے مرے ساتھ تم جو چلو مگر
یہ رہِ وفا ہے رہِ وفا، کوئی عام راہگذر نہیں

جو پڑیں وفا کی رِوایتیں تو رہیں نہ کوئی شِکایتیں
وہ حسیں سہی وہ جواں سہی مگر اس کا نام سحر نہیں

ہمیں خالد اب بھی یقین ہے درِ یار دُور نہیں مگر
کوئی ایسی راہ نکالئے جہاں رہبروں کا گذر نہیں

قطعہ

چمن چمن یہ بیاباں، اُفق اُفق یہ سراب
مجھے یقین ہے پھر بھی مرے اُداس ندیم
اُمڈ پڑے گی بہاراں اسی بیاباں سے
اسی سراب سے پھوٹیں گے کوثر و تسنیم

تیری ہر ایک بات شرارا ہے جانِ جاں
تو چپ رہے تو یہ بھی اشارا ہے جانِ جاں

کیا چند اشک دے کے ہمیں آزماتے ہو
تم زہر دو تو وہ بھی گوارا ہے جانِ جاں

تم نے جلا کے راکھ ہمیں کر دیا مگر
اس راکھ میں بھی ایک شرارا ہے جانِ جاں

یہ فن کے چند پھول ، یہ سرمایۂ حیات
جو کچھ لکھا ہے میں نے تمہارا ہے جانِ جاں

پتھر کی مورتی کو سمجھتے رہے خدا :
سارا قصور اس میں ہمارا ہے جانِ جاں!

خالد قصوروار و خطا کار ہی سہی
جانے بھی دو کہ وہ بھی ستارا ہے جانِ جاں

قطعہ

روش روش پہ ہیں کانٹوں کے سلسلے یوں تو
کلی کلی ہے شراروں کی گود میں اے دوست
ہم ان غموں کا مداوئی تلاش کرتے ہیں
جو غم پلے ہیں بہاروں کی گود میں اے دوست

ہم غریبوں کی اگرچہ جاں بھی نذرانے میں ہے
عافیت کی بات کعبے میں نہ بُت خانے میں ہے

جب ہمیں صیدِ زبوں تھے ہو گئے وہ دن بھی خواب
اب یہ عالم ہے کہ سارا شہر ویرانے میں ہے

فلسفی ہوتے تو کھو جاتے خود اپنی ذات میں
ہم کدھر جائیں کہ دل بھی اس کے بہکانے میں ہے

ہر گھڑی اس کے لبوں پر خیر کے کلمے سہی
فائدہ اس کو فقط نقصان پہنچانے میں ہے

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ حُسن اس کو کیا خبر
محو وہ اتنا ہمیں زنجیر پہنانے میں ہے

لے رہے ہیں شیخ سے تشنہ لبی کی داد لوگ
ہم رہے مُجرم کہ دل کا خون پیمانے میں ہے

آج بھی گرچہ ہماری یاد اس کے دل میں ہے
یہ نہیں معلوم دل کے کون سے خانے میں ہے

ذکر ہم کر دیں تو خالد منھ چُھپا لے آفتاب
ایک نام ایسا ہمارے دل کے افسانے میں ہے

قطعہ

کچھ ساغر و مینا سے نہیں ، مے سے غرض ہے
ٹوٹے ہوئے ساغر سے بھی ہم پیتے رہیں گے
ہے سانس بھی باقی تو کفن فصلِ خزاں کا
جکڑے ہوئے ہاتھوں سے بھی ہم سیتے رہیں گے

عدو منّت کشِ اہلِ سخن ہیں !!!
ہم اپنی ذات میں خود انجمن ہیں!

تمہارا ساتھ سر آنکھوں پہ لیکن
ہماری راہ میں دار و رسن ہیں !!!

دیارِ یار کو الزام کیا دیں
جو خود اپنے وطن میں بے وطن ہیں

دکھاتے ہو ہمیں کیا زخم دل کے
ہمارے یار بھی کچھ گلبدن ہیں

خدا کا ذکر بھی ہے بے محل اب
وہ اپنے آپ میں اتنے مگن ہیں

قلوپطرہ کوئی رقصاں ہو شاید !!
چمن میں پھول بھی اب ناگ پھن ہیں

کسی کے روبرو خالد کہیں کیا
زیادہ فہم وہ ہم کم سخن ہیں !!

قطعہ

دستِ گلچیں پہ بہاروں کو فدا دیکھا ہے
شیخ پر بادہ گساروں کو فدا دیکھا ہے
جہل و افلاس سے دھندلائی ہوئی راہوں میں
ظلم پر ظلم کے ماروں کو فدا دیکھا ہے

عدو منّت کشِ اہلِ سخن ہیں !!!
ہم اپنی ذات میں خود انجمن ہیں!

تمہارا ساتھ سر آنکھوں پہ لیکن
ہماری راہ میں دار و رسَن ہیں !!!

دیارِ یار کو الزام کیا دیں
جو خود اپنے وطن میں بے وطن ہیں

دکھاتے ہو ہمیں کیا زخم دل کے
ہمارے یار بھی کچھ گُلبدن ہیں

خُدا کا ذکر بھی ہے بے محل اب
وہ اپنے آپ میں اتنے مگن ہیں

ـرہ کوئی رقصاں ہو شاید !!
ن میں پھول بھی اب ناگ پھن ہیں

کسی کے رُوبرو خالد کہیں کیا
زیادہ فہم وہ ۔ ہم کم سخن ہیں !!

قطعہ

دستِ گلچیں پہ بہاروں کو فِدا دیکھا ہے
شیخ پر بادہ گُساروں کو فِدا دیکھا ہے
جہل و افلاس سے دھندلائی ہوئی راہوں میں
ظلم پر ظلم کے ماروں کو فِدا دیکھا ہے

جو چُپ رہے تو در و بام ہو گئے ہم لوگ
خود اپنے شہر میں نیلام ہو گئے ہم لوگ

وہ شمعِ بزمِ رقیباں تو معتبر ٹھہرا
مگر نشانۂ الزام ہو گئے ہم لوگ !!

کئے ہیں بند اُجالوں پہ دل کے دروازے
سحر تو بن نہ سکے شام ہو گئے ہم لوگ

میں سوچتا ہوں کہ صرصر صبا سے بہتر تھی
چلی صبا تو گُل اندام ہو گئے ہم لوگ !

ہمیں تو خونِ شہیداں کی لاج رکھنی تھی !!!
شہیدِ بخشش و انعام ہو گئے ہم لوگ

ہزار رنگ سے غارت ہوئے مگر خالدؔ
ذرا سی دیر میں پھر رام ہو گئے ہم لوگ

قطعہ

گریاں ہیں آبشار، ترنّم بھی چِھن گیا
موجیں اُداس ہیں کہ تلاطم بھی چِھن گیا
اب کے برس کمالِ بہاراں تو دیکھئے!
پھولوں سے اختیارِ تبسّم بھی چِھن گیا

میسّر اگر لب کشائی نہیں ہے
اسیری سے بہتر رہائی نہیں ہے

شگوفے بھی ہیں سنگباری کی زد میں
ابھی شیخ نے چوٹ کھائی نہیں ہے

کہاں میں، کہاں وہ مجسّم بہاراں!
شناسائی ہے آشنائی نہیں ہے

محبت کو پابندِ حالات کرنا!
یہ کچھ بھی سہی دِلربائی نہیں ہے

سرِ دار بھی عشق کرنا ہے خالدؔ
ہماری کسی سے لڑائی نہیں ہے!!!

کروں گر فکر جنّت کی تو دنیا جاتے ہے مجھ سے
اسے چاہوں تو سارا شہر بگڑا جائے ہے مجھ سے

محبّت کی فضا میں قتل ہونا بھی عبادت ہے
مگر جو ہاتھ خنجر ہے ، نہ چُوما جائے ہے مجھ سے

وفا کی رہگذر ہے اور دیوانہ تنِ تنہا
یہ وہ اعزاز ہے اس سے نہ چھینا جائے ہے مجھ سے

قفس تو شور میں اہلِ قفس کے ڈوب جائے گا
مآلِ آشیاں لیکن نہ سوچا جائے ہے مجھ سے

اگرچہ شہر میں زاغ و زغن کا شور ہے خالدؔ
مگر یہ شہر اپنا ہے ، نہ چھوڑا جائے ہے مجھ سے

زخم بھر نہیں سکتے نیم جاں بہاروں سے
ہم گذر کے آئے ہیں کتنے شعلہ زاروں سے

گھر کے لالہ و گل ہی اجنبی سے ہیں ورنہ
کون پیار کرتا ہے اجنبی بہاروں سے

اہلِ دل پہ تعزیریں ، بارشِ کرم ان پر
وہ جو مانگ لائے ہیں داغ لالہ زاروں سے

کون اُن کی زُلفوں سے کھیلتا ہو کیا جانے
تیرگی ٹپکتی ہے چاند سے ستاروں سے

مہ جبیں ہو لیلیٰ ہو کوئی چھیڑ دے لیکن !
گیت انہی کے اُٹھتے ہیں سازِ دل کے تاروں سے

رو نہ دیں ہمیں سُن کر وہ کہیں سرِ محفل
ہم چرا کے لائے ہیں گیت آبشاروں سے

ہر قدم پہ لٹنے کا خوف ہے نہ ہو جب تک
شہرِ آرزو خالدؔ پاک شہریاروں سے

قطعہ:

کتنے وعدوں کے گھر، کتنی تمناؤں کے پھول!
وقت کی تُند ہواؤں میں بکھر جاتے ہیں
ہائے یہ دل جو نزاکت میں ہے شیشے سے سوا
حادثے کتنے اسی دل پر گزر جاتے ہیں

جو لوگ رہِ عشق میں ناکام رہے ہیں !!!
وہ لوگ ہی اب قابلِ انعام رہے ہیں

فریادِ بلبل یوں تو عنادل بھی ہیں گل بھی
گلشن میں ہمیں موردِ الزام رہے ہیں !!

کچھ کوچۂ جاناں ہی پہ موقوف نہیں ہے
ہم کوچۂ قاتل میں بھی بدنام رہے ہیں !!

ساقی کا بھرم آج بھی قائم ہے انہیں سے
وہ لوگ جو محفل میں تہی جام رہے ہیں

ہیں آج کچھ اغیار بھی محفل میں تو غم کیا
کچھ روز تو کعبے میں بھی اصنام رہے ہیں

ہیں اہلِ نظر منتظرِ جلوۂ خورشید !
مہتاب تو کتنے ہی سرِبام رہے ہیں

قطعہ

زُلف کے روپ میں برسا ہے جو ویرانوں پر
میری تقدیر میں وہ ابرِ گہربار کہاں
تم نے بخشی ہیں تو فرقت کی صلیبیں مجھ کو
میری قسمت میں بہشتِ لب و رخسار کہاں

اپنی راہوں سے جو بھٹکا ہوا سیّارہ ہے
اس کا دعویٰ ہے کہ وہ نُور کا فوّارہ ہے

رند رکھتے ہیں نظر ماضیؔ و مستقبل پر
اس کی اوقات فقط وقت کا نظّارہ ہے

سنگ پارے ہیں سبھی حُسن کے پتلے لیکن
جو نگاہوں میں سما جائے وہ مہ پارہ ہے

چند لمحوں کے لیے شب کی بھی سُن لی ورنہ
وہ جو سورج ہے اندھیروں سے کہیں ہارا ہے

ظلم ہے یورشِ ظلمات ہے اس بستی پر
قبلِ عیسیٰ سے جو تہذیب کا گہوارہ ہے

شہرِ بے مہر کا ماتم بھی نہ کیجے خالد!
کیجئے شکر کہ زندہ دلِ آوارہ ہے

قطعہ

موجِ تسنیم کو گرداب نہ ہونے دینا
تنگ یہ حلقۂ احباب نہ ہونے دینا
انجمن اپنی کسی خواب کی تعبیر سہی!!
اب خفیفت ہے اسے خواب نہ ہونے دینا

چشم و گیسو کا کوئی ذکر نہ رُخسار کی بات
بیٹھ کر کیجئے ان سے در و دیوار کی بات

یہ ادائیں، یہ اشارے، یہ حسیں قول و قرار
کتنے آداب کے پردے میں ہے انکار کی بات

رات بھر جس کی تمنّا میں جلے ہیں ہم لوگ
وہ سحر شیخ کی نظروں میں ہے کفّار کی بات

بزمِ اغیار اگر ہو تو بچھے جاتے ہیں
اور کرتے ہیں وہ ہم سے رسن و دار کی بات

مدحِ صیاد بہرحال ضروری تو نہیں
چپ رہو، یہ بھی ہے اب جرأتِ کردار کی بات

شاعری خونِ جگر خونِ تمنا ہے مگر !!!
چند لوگوں کی بدولت ہوئی بازار کی بات'

شہر کا شہر فصیلوں پہ اُمنڈ آئے گا
بات چلتی ہے تو رہتی نہیں دوچار کی بات

کس بھروسے پہ کریں عشق کا سودا خالدؔ!
وقت شاہد ہے کہ رہتی نہیں تلوار کی بات

قطعہ

آنسوؤں کی سبیل ہے یارو!
درد کی شب طویل ہے یارو
لیکن اس شب کی ایک ایک گھڑی
صبحِ نو کی دلیل ہے یارو!!!

احساسِ شباب ہو چلا ہے
کیا ختم یہ خواب ہو چلا ہے

تھا جس کے کرم پہ ناز وہ بھی !
مائل بہ حساب ہو چلا ہے

کان اس کی زباں سے آشنا تھے
کیوں آپ جناب ہو چلا ہے

راس آئی ہے بے وفائی اس کو
پریوں کا جواب ہو چلا ہے

بُلبل کے لہو کا رنگ دیکھو !!
کانٹا بھی گلاب ہو چلا ہے

ایماں پہ ہے لطفِ شیخ جب سے
کچھ اور خراب ہو چلا ہے

اشکوں پہ رواں ہے اب سفینہ
دریا تو حباب ہو چلا ہے

ہم اور یہ سازشوں کا موسم
سورج بھی نقاب ہو چلا ہے

کیا رکھئے امیدِ وصل خالدؔ
درباں بھی نواب ہو چلا ہے

بیانِ یار ہے زیر و زبر سے کیا ہوگا
جنوں کی راہ میں دیوار و در سے کیا ہوگا

کلی کلی کو تمنّا ہے سربلندی کی
فرازِ دار پہ اب ایک سر سے کیا ہوگا

یہ اور بات ہے انجان بن گئے کچھ لوگ
انہیں بھی علم ہے تیغ و تبر سے کیا ہوگا

وہاں تو سکّۂ نقدِ حیات چلتا ہے
حضورِ یار بھلا سیم و زر سے کیا ہوگا

جو ہو سکے تو چھپا لیجئے ہمیں دل میں
ہزار زخم ہیں اب اک نظر سے کیا ہوگا

سحر ہوئی بھی تو شاید ہمیں رہیں مصلوب!
وہ تیرگی ہے دِلوں میں سحر سے کیا ہوگا

کٹی ہے عمر اسی کے فراق میں خالد
بہم نہ ہوں جو ستارے بشر سے کیا ہو گا

قطعہ

ہر گیت پہ ہر لے پر چاک اپنا گریباں ہے
ہر تان پہ رقصاں ہیں، ہم لوگ ہیں دیوانے
ہم سادہ طبیعت ہیں من جاتے ہیں پل بھر میں
پھر کیوں نہ کوئی توڑے وعدوں کے صنم خانے

نگاہِ گُل نے ہمیں ایک خواب بھی نہ دیا
سلامِ بادِ صبا کا جواب بھی نہ دیا

انُہیں کے جشن مناتے رہے جنہوں نے کبھی
کوئی بہانۂ چنگ و رباب بھی نہ دیا

وہ نادہند تو ہرگز نہ تھا مگر اب کے
گیا جو لے کے تو دل کا حساب بھی نہ دیا

جو کچھ نہیں تو اسی بات پر وہ برہم ہے
کہ ہم نے اس کو ولی کا خطاب بھی نہ دیا

تمام عمر سُنے شہرزاد کے قصّے!
هزار رات نے اک آفتاب بھی نہ دیا

دلوں میں جذب ہوئی شب کی تیرگی خالد
سحر نے ایک رخِ بے نقاب بھی نہ دیا

قطعہ

ایسے بھی مناظر ہیں کہ رہ جاؤ گے حیراں!
دیوار پہ سنو پسِ دیوار تو دیکھو !!!
مانا کہ اجالا بھی سرِ شہر ہے لیکن
زنداں کی سحر ہے رسن و دار تو دیکھو!

دھوپ کی فرماں روائی اور مہ پاروں کے خواب
سخت جاں ہیں ہم کہ بُن لیتے ہیں انگاروں کے خواب

یہ تو ممکن ہے کہ زنداں میں کٹے یہ رات بھی!
یہ نہ ہوگا دیکھنے لگ جائیں دیواروں کے خواب

شیخِ شب بیدار، تو دن میں بھی اب سوتا نہیں
نیند اڑا کر لے گئے اُسکی گنہ گاروں کے خواب

ایک دن درشن کراتا ہے جو وہ گلُ پیرہن!
دیکھتے رہتے ہیں برسوں ہم سمن زاروں کے خواب

خاک ہو جائے گا سارا شہر تب شاید کہیں
شہر والوں کی سمجھ میں آئیں بنجاروں کے خواب

راکھ ہو جائے رقابت میں نہ جل کر آفتاب
رات ہم تھے اور کچھ مدہوش سیاروں کے خواب

کون خالدؔ ہے یہاں یوسف جسے جا کر سنائیں
ہم پہ ٹے تعبیرِ خواب اور وہ بھی بیداروں کے خواب

قطعہ

آرزوؤں کے چمن زار سے آگے نہ بڑھے
لالہ زارِ لب و رُخسار سے آگے نہ بڑھے
ہو کے رہ جائیں گے گردِ رہِ دوراں خالدؔ
ہم اگر وقت کی رفتار سے آگے نہ بڑھے

عشق کو ناؤ ملی ، ناؤ کو ساحل نہ ملا !
ناخداؤں میں سبھی کچھ تھا مگر دل نہ ملا

دل کو حسرت ہی رہی دادِ جفا دینے کی
زندگی بیت گئی اور وہ قاتل نہ ملا !

زندگی وقف ہے خورشید کو جھٹلانے میں
حضرتِ شیخ سے بڑھ کر کوئی جاہل نہ ملا

آگ کا کھیل ہے اور صاحبِ خانہ یارو
کوئی گھر اور اُسے لطف کے قابل نہ ملا

اس کے خوابوں میں ہمیں اسکے خیالوں میں ہمیں
کیا ہوا ہم سے جو کوئی سرِ محفل نہ ملا

اور احباب کی تفتیش پہ اب کیا کہیے!
وہ جو قاتل تھا وہی قتل میں شامل نہ ملا

آزماتے ہیں مقدر کے بہانے ہم کو
چاند تاروں کو کوئی مدِّ مقابل نہ ملا

قطعہ

حق گوئی کے مجرم رسن و دار سے بچ جائیں
تہذیب ابھی اتنی فراواں تو نہیں ہے
حیراں ہیں وہ کیوں سر بکفن دیکھ کے مجھ کو
مقتل ہی تو ہے صحنِ گلستاں تو نہیں ہے

دوسروں کی عاقبت اور اپنی دنیا کا خیال
شیخ جی نے خوب رکھّا شاہِ بطحا کا خیال

دشت چھُٹ سکتا ہے لیکن عشق چھُٹ سکتا نہیں
شہر میں بھی قیس کی معراج ، لیلیٰ کا خیال

اور ہوں گے وہ جو اک ابرِ گریزاں کے لیے
ترک کر دیتے ہیں ناہید و ثریّا کا خیال

اس کی قربت تھی تو ہم سا پارسا کوئی نہ تھا
ہاں اسی کو آج تک آیا نہ عقبیٰ کا خیال

عشق میں وہ کس قدر کوتاہ قد ثابت ہوئے
دار پر بھی تھا ہمیں جن کے سراپا کا خیال

ایک ہی گل تھا اسے بھی دستِ گلچیں بھا گیا
چھوڑیئے خالدؔ اب اس جانِ تمنا کا خیال

قطعہ

محفل میں یہ نظّارۂ رُسوائیٔ احباب !
دیکھیں گے تو ہم زیرِ قلم کرتے رہیں گے
دیدارِ سحر بات مقدّر کی ہے لیکن !
ہم تیرگیٔ شب کو تو کم کرتے رہیں گے

مشکلوں کو قافلے کا پاسباں رہنے دیا
جذبۂ منزل کو میرِ کارواں رہنے دیا

لالہ رُخ نسریں بدن سب کی جوانی ڈھل گئی
ہم نے اپنی حسرتوں کو نوجواں رہنے دیا

ہم نے ہر محفل سے کچھ کچھ نُور اڑایا ہے مگر
تم کو اپنی بزم کی روحِ رواں رہنے دیا

ہم تہلکہ سا مچا سکتے تھے ہر اک بزم میں
وقت نے دو دن ہمیں یکجا کہاں رہنے دیا

سبزۂ و برگ و گل و بلبل پہ آنچ آنے نہ دی
بجلیوں کی زد میں اپنا آشیاں رہنے دیا

ہم ہو گئے شہید یہ اعزاز تو ملا
اہلِ جنوں کو نقطۂ آغاز تو ملا !!

وہ کاروانِ شب کا ہوا آخری چراغ
لو شیخ کو یہ منصبِ ممتاز تو ملا

ہم کو جو سُن رہا ہے وہ مخبر سہی مگر
محفل میں کوئی گوش بر آواز تو ملا !!

ہم خود ہی بے سُرے تھے قصیدہ نہ پڑھ سکے
اس بزم میں اشارۂ آغاز تو ملا !

خالد یہ رنگِ شہر نہ تھا ہم سے پیشتر
صد شکر کرگسوں کو کوئی باز تو ملا

اب اس سے اس کے قراروں کی بات کون کرے
قفس میں چاند ستاروں کی بات کون کرے

عدو کی بزم ہے یاروں کی بات کون کرے
حرم میں بادہ گساروں کی بات کون کرے

بیانِ حالِ جگر تک تو ہم سے ہو نہ سکا
قبائے چاک کے تاروں کی بات کون کرے

بنا ہے وہ بھی تغافل شعار تھا تو نہیں
اب انجمن میں اشاروں کی بات کون کرے

ہر ایک گلُ رسن و دار کا بہانہ ہوا
تمہارے شہر میں ہاروں کی بات کون کرے

ہزار ناز سہے کوئی التجا بھی نہ کی
کہ شاخِ گل سے سہاروں کی بات کون کرے

ہم اس فضائے مکدّر سے نااُمید نہیں
خزاں نہ ہو تو بہاروں کی بات کون کرے

وہ رحم دل ہی سہی اس کے رُوبرو خالدؔ
ہم ایسے سینہ فگاروں کی بات کون کرے

قطعہ

ہر رات جو کرتے ہیں ستاروں کی تجارت
خورشیدِ درخشاں کے مخالف ہیں وہی لوگ
ہیں جن کی شبیں حُسن کے اشکوں سے منوّر
بیداریٔ نسواں کے مخالف ہیں وہی لوگ

سب کچھ بھلا کے آؤ پھر اک بار ہم ملیں
ممکن ہے اس کے بعد یہ لمحے بھی کم ملیں

اس فتنہ گر نے پھر سے سجائی ہے انجمن
شاید کچھ اور زخم بنامِ کرم ملیں

یارو خزاں سے ہار نہ مانو کہ راہ میں
ممکن ہے چند پھول ابھی تازہ دم ملیں

اس سنگدل نے ہم کو بلایا تو ہے مگر
جس آدمی سے دل نہ ملے، کیسے ہم ملیں

خالد جنہوں نے ہم کو رلایا تمام عمر
خلوت میں جھانکیئے تو وہ آنکھیں بھی نم ملیں

LAB-E-SAHER

By

Khalid Yusuf

Publishers

INSTITUTE OF THIRD WORLD ART & LITERATURE
16 Windermere Road, London W5
Phone: 01-567-6775 TLX: 928575 FAX 01-903-7638

Printed in Great Britain by
Star Printers U.K. Limited
Luton, England
Tel: Luton (0582) 581572

ISBN 0-948977-04-3